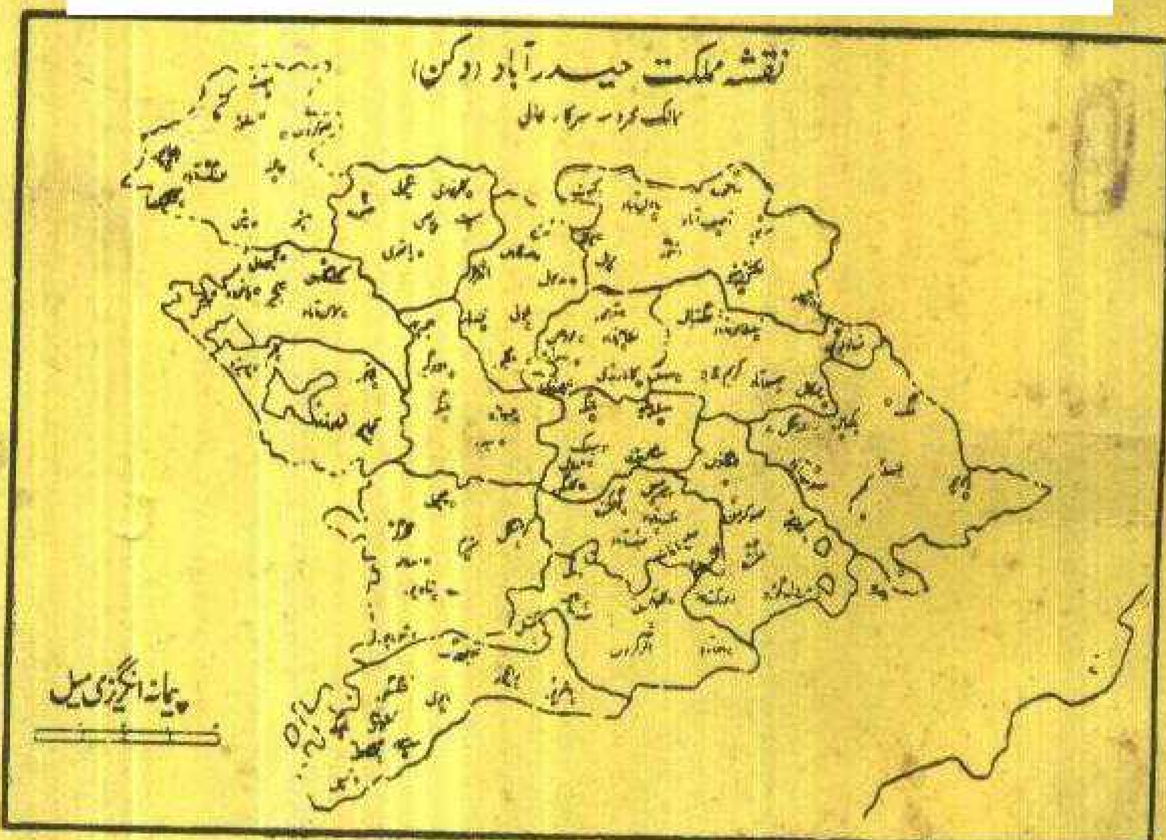
تاثراتِ دکن

مولانا عبدالماجد دریابادی



بہادر یار جنگ اکادمی کراچی

تاثرات دکن

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

بہادر یار جنگ اکادمی کراچی

*

اشاعت ——— یوم حیدر آباد دکن ۱۷ر ستمبر ۷۷ء

تعداد اشاعت ——— ایک ہزار

کتابت ——— محفوظ علی

طباعت ——— انجمن پریس کراچی

قیمت ——— پانچ روپیہ

|||||||

ملنے کا پتہ :-

بہادر یار جنگ اکادمی

سراج الدولہ روڈ۔ بہادر آباد۔ کراچی ۵



اعلیحضرت میر عثمان علی خان نظام سابع
آخری تاجدار مملکتِ آصفیہ

پیش لفظ

مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم برصغیر ہند کی گنی چنی نامور ہستیوں میں سے تھے، ماہر نفسیات، فلسفی، صحافی، نقاد، مبصر، عالم، مترجم اور مفسر قرآن! کئی بلند پایہ علمی وادبی کتابوں کے مصنف، اپنے رنگ کے منفرد انشاء پرداز اور صاحب طرز ادیب!! ہفتہ وار سچ پھر اس کے نقش ثانی صدق (لکھنؤ) کے ذریعہ، وہ ایک عرصہ دراز تک تہذیب جدید کی لائی ہوئی گمراہیوں کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہے۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سلطنت اسلامیہ آصفیہ حیدرآباد دکن سے مولانائے محترم کو تعلق خصوصی رہا۔ (اور برصغیر ہند کی کس نامور مسلم ہستی کو نہیں رہا ہے؟) وہ ۱۹۱۷ء میں بحیثیت رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن تشریف لائے اور تقریباً ایک سال قیام کیا۔ یہیں انہوں نے فلسفہ ومنطق کی بعض انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ گویا مملکت دکن سے تعلقات کی ابتداء تھی اس کے بعد وہ اپنے وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی (یوپی) لوٹ گئے، لیکن حیدرآباد کے نقوش ان کے دل سے محو نہیں ہوئے بلکہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ نقوش گہرے ہوتے گئے۔ مملکت آصفیہ سے ان کی وابستگی کی بنیادی وجوہ دو تھیں ایک تو اس سلطنت کی اسلامی نوعیت

اور دوسری قائد ملت بہادر یار جنگ کی مومنانہ شخصیت جن کی نگاہ میں مملکت حیدرآباد "مسلمانانِ برصغیر کے جاہ وجلال کی آخری یادگار تھی" اور بہادر یار جنگ "مولانا محمد علی جوہر کے حقیقی جانشین بلکہ نقش ثانی"

دکن میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی، مولانا دریاآبادی کو اس کی فلاح و بہبود سے بڑی دلچسپی تھی۔ ہفتہ وار صدق کے ذریعہ وہ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے۔ صدق بھی حیدرآباد میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا رہا۔ سقوط حیدرآباد کے المیہ کا مولانا کے دل پر جو اثر ہوا اس کا اظہار بھی انھوں نے وقتاً فوقتاً صدق میں کیا۔ تاہم اس المیہ کے بعد بھی مسلمانان حیدرآباد اور حیدرآباد کی مسلم ثقافت سے ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ اس حادثہ کے تقریباً پندرہ سال بعد اکتوبر ۱۹۶۳ء میں مولانا نے اپنے ایک قریبی عزیز نواب ناظر یار جنگ، رکن عدالت عالیہ حیدرآباد (جج حیدرآباد ہائی کورٹ) کی دعوت پر حیدرآباد کا سفر کیا۔ ۱۷، ۱۸ دن (۲۹ ستمبر تا ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۳ء) وہاں قیام کیا اور دریاآباد لوٹ کر اپنے اس سفر اور قیام سے متعلق روئیداد کو صدق کے آٹھ نمبروں (۳ جنوری ۱۹۶۴ء تا ۲۱ فروری ۱۹۶۴ء) میں شائع کیا۔ یہ روئیداد کیا ہے، اس میں "حیدرآباد مرحوم و مغفور" (سابق مملکت اسلامیہ آصفیہ دکن) کی تہذیب و ثقافت کی نظر افروز جھلکیاں ہیں، قائد ملت بہادر یار جنگ کے علاوہ دکن کے بعض مرحوم مشاہیر اور زندہ علمی و ادبی شخصیتوں کی دلکش تصویریں ہیں اور حیدرآباد کے دینی، اسلامی، علمی و ادبی اداروں

لہ "بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں" مرتبہ بہادر یار جنگ اکیڈمی مطبوعہ کراچی جون ۱۹۶۷ء ص ۳۷۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو مولانا محمد علی جوہر کی ذات گرامی سے عشق تھا، جس کا اظہار ان کی کتاب "محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق" سے ہوتا ہے، دو جلد

کا دلچسپ تذکرہ ہے! ان نوجوانوں کے لیے، جنہوں نے حیدرآباد کے متعلق صرف سنا ہے، دیکھا نہیں اور ان کے لیے بھی، جنہوں نے حیدآباد کو دیکھا تو ہے پھر بھی بار بار دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، مولانا کی یہ روداد تصوّر کے پردۂ سیمیں پر گویا حیدرآباد کی چلتی پھرتی حسین و رنگین فلم ہے مولانا کے اس سفرنامہ کو میں نے "تاثراتِ دکن" کے عنوان سے، معہ ضروری حواشی کے، کتابی صورت میں مرتب کیا ہے۔ جناب محمد وحید الدین خان لیوزئی معتمد اکادمی قابل مبارک باد ہیں کہ ان کے ذہن میں اس کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا اور انہیں کے حسنِ اہتمام سے یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے

محمد احمد خاں
میر مجلس بہادر یار جنگ اکادمی

کراچی
یکم ستمبر ۱۹۷۷ء

مولانا عبدالماجد دریابادی

تاثراتِ دکن

دکن! یعنے کیا؟

دکن سے مراد سمت جنوب نہیں مملکت دکن یا ریاست حیدرآباد ہوتی تھی کان اس کے سننے کے، آنکھیں اس کے پڑھنے کی، دل اس کے سمجھنے کا عادی۔ جی نہیں مانتا کہ اس پرانی، محبوب، دل پسند اصطلاح کو یکلخت چھوڑ دیجئے۔ اور کسی نئی سیاسی، کسی نئی جغرافیائی اصطلاح کو زیب عنوان بنانے لگیے!

ایک تمنا جو پوری ہوئی

زیارت حیدرآباد کی تمنا ایک آدھ سال سے نہیں برسوں سے چلی آرہی تھی ـــــ اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی مانع قوی، عزم میں حائل ہوتا گیا۔ آخری بار آمد ایک خانگی تقریب سے اکتوبر سنہ ۳۸ء میں ہوئی تھی۔ پورے ۲۵ سال کے بعد اکتوبر سنہ ۶۳ء میں خواب کو پورے ہونے کا موقع نکلا۔ (درمیان میں ایک بار حاضری، فروری سنہ ۵۸ء میں دن

لے بھارتی قبضہ کے بعد ریاست حیدرآباد دکن کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر کے، اس کے آٹھ اضلاع (تلنگانہ) کو مدراس کے تلنگی بولنے والے اضلاع سے ملا کر نہرو کے دور حکومت میں ایک نیا صوبہ بنام آندھرا پردیش بنایا گیا۔ مولانا کا اشارہ اسی المناک واقعہ کی طرف ہے کہ حیدرآباد پر نہ صرف غاصبانہ قبضہ کیا گیا بلکہ اسکی تاریخی و ثقافتی وحدت کو بھی پارہ پارہ کر دیا گیا۔ مرتب

کے چند گھنٹوں کے لئے ہوئی تھی، لیکن اسے حاضری کہنا ہی صحیح نہیں وہ تو مدراس سے لکھنؤ کی واپسی تھی براہ حیدر آباد اس لئے اس ذکر ہی کو سرے سے الفظ کیجئے۔ اب پہلی بار آنا بہ صد شوق و اشتیاق، ستمبر ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا سر رشتہ تالیف و ترجمہ کے رکن کی حیثیت سے اور گویا (۱۱) مہینے جم کر رہنا بھی ہوا تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی ابھی باقاعدہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس کی ڈانغ بیل پڑ چکی تھی۔ اور بہ طور تمہید یہ نیا ادارہ سر اکبر حیدری، سر راس مسعود اور بابائے اردو عبد الحق کی سرپرستی میں قائم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی بارہا آنا ہوا، اور ایک آدھ قیام بھی دنوں کا نہیں ہفتوں کا رہا۔ ۲۵ سال کا وقفہ کوئی معمولی ہوا ہے۔ جوان بوڑھے ہو گئے اور جو ۴۶ سال کا ادھیڑ تھا وہ ۷۰، ۷۱ سال کی عمر کو پہنچ چکا!

آغاز سفر

تقریب سفر اب کی بھی بالکل خانگی ہی تھی، اور اب سفر عموماً نجی ہی کے ہوتے ہیں۔ قومی اور پبلک جلسوں میں شرکت کا معمول سالہاسال سے ترک ہے۔ صدق نوازوں اور دوسرے کرم فرماؤں کے خط پر خط اس ساری مدت میں برابر پہنچتے رہے کہ فلاں یوم منایا جارہا ہے۔ فلاں کی سال گرہ ہے۔ فلاں کی برسی ہے، فلاں ادبی کنونشن ہے فلاں دینی کانفرنس ہے اور کبھی کبھی تو دعوت نامے تار پر پہنچے اور خواہش ہوائی جہاز سے سفر کی کی گئی۔ فرمائش کرنے والے مخلصوں کو

بے خبر بود نداز حالِ درون

کے مصداق اس کی کیا خبر کہ ان خطوط پر اصرار کرنے کا اثر ہمیشہ الٹا ہی پڑا، بلکہ طبیعت

یں انقباض ہی پیدا ہو کر رہا، یہ حضرات ذرا بھی غور نہیں کرتے کہ اگر ایک بار بھی کسی پبلک جلسے کے لئے قدم باہر نکالا، تو پھر قومی و ملی جلسوں کی کوئی حد و نہایت ہے؟ ہر جلسہ اپنی جگہ اہم اور ضروری، وطن کی واپسی ہی دشوار ہو جائے گی اور صدق کا ہی نہیں، کہنا چاہئے کہ تحریر کا سارا ہی دفتر بند کر دینا ہوگا! تصنیف و تالیف کا کام ہمہ وقتی مطالعہ چاہتا ہے۔ اور پورا سکونِ خاطر۔ سفر کی ناہمواریاں خلقت کا ہجوم، تقریری ہیجان یہ سب اس کے لئے جو گویا اب مقصدِ حیات بن چکا ہے، زہرِ قاتل! کسی بزرگ کی زیارت کرنی ہوئی یا کسی عزیز کی عیادت، یا کسی محدود اور چھوٹی سی کمیٹی میں شرکت، بس یہی لے دے کے دو ایک صورتیں ہیں جو اس ترکِ سفر کے عہد میں استثناء کی گنجائش پیدا کر سکتی ہیں ــــ تقدیرِ الٰہی نے ایسی ہی ایک صورت اخیر ستمبر میں پیدا کر دی۔ اور ڈھائی ہفتہ کا پروگرام بنا۔ ۲۷/ ستمبر کو صبح سویرے لکھنؤ سے حیدرآباد کے لئے "رَبِّ اَدْخِلْنِی مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِی مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّی مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا" ۝

پڑھتا ہوا ریل کے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ گھوڑے پر کہ وہی ایک زمانہ میں بہترین سواری تھی، سوار ہوتے وقت تک کی دعا ماثور کتابوں میں یہ آیت قرآنی پڑھی تھی۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ	پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے تابع کر دیا اس (سواری) کو ورنہ ہم تو ایسے تھے نہیں۔ کہ ہم قابو میں کر لیتے اس کو۔

اور گھوڑے کی تسخیر سے کہیں بڑا "اعجوبہ" تو ریل اور انجن کی تسخیر ہے اور گھوڑے کی سواری پر آیت کا محل اگر ایک بار پڑھنے کا تھا تو ریل پر پڑھنے کا تو بار بار۔

افسوس ہے (اور حیرت بھی) کہ ملک کے دو ایسے اہم صوبائی دارالحکومتوں

کے درمیان جیسے کہ حیدرآباد اور لکھنؤ ہیں کوئی سیدھا اور براہ راست ریلوے رابطہ نہیں۔ دہلی سے آگرہ جھانسی ہوتے ہوئے جو سیدھی ٹرین (جی، ٹی ایکسپریس) مدراس کو جاتی ہے۔ اس میں دو سیدھی بوگیاں حیدرآباد کے لئے ہوتی ہیں۔ جو قاضی پیٹ میں کاٹ کر حیدرآباد کی ٹرین سے جوڑ دی جاتی ہیں، لیکن اس سے لکھنؤ والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ انہیں وہ سیدھی حیدرآباد والی بوگیاں کہیں جھانسی پہنچکر ملتی ہیں۔ اور وہاں وہ گاڑی رات کو بہت ہی ناوقت ملتی ہے۔ اس وقت گاڑی بدلنا ٹکٹ خواہ کسی درجہ کا ہو، بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس لئے لکھنؤ والے اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ بمبئی والی گاڑی پر لکھنؤ سے سیدھے اٹارسی چلے جائیں۔ اور وہاں سے دن کے وقت حیدرآباد والی گاڑی پر بیٹھیں۔ اپنے کو مناسب یہ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے صبح سویرے بمبئی والی گاڑی پر چل کر ۸ بجے شب کے بعد بھوپال اتر لیا جائے۔ اور رات بھر وہاں رہ کر صبح سویرے حیدرآبادی بوگی میں بیٹھ کر روانہ ہو جائے۔ بھوپال جنکشن کے ویٹنگ روم، ریٹائرنگ روم میں خوب گنجائش اور جاذب نظر بھی اپنے دو ایک ذی اثر عزیز بھی وہاں موجود، اور سب سے بڑھ کر مولانا عمران خان ندوی، مہمانداری کے لئے موجود ہی نہیں، میزبانی کے لئے ہر وقت مستعد و کمربستہ۔ رائے یہی طے پاگئی، اور مکین کے مکان موسوم بہ "غریب خانہ" کو اپنا "کاشانۂ شب یا رین بسیرا" تجویز کر لیا۔

غریب خانہ

۲۷ کو عشاء کا وقت ہو چکا تھا کہ بمبئی میل بھوپال اسٹیشن میں داخل ہوا۔ پلیٹ فارم پر خان صاحب مع اپنے خدم و حشم کے نظر پڑ گئے۔ ہاتھوں ہاتھ سامان اتروا

ایک بڑی سی جیپ گاڑی پر بیٹھا، بات کی بات میں اپنے "غریب خانہ" پہنچا دیا۔ غریب خانہ کے نام سے تخیل کیا ذہن میں آتا ہے؟ یہی نہ کہ تنگ سا ایک آدھ حجرہ، پست سا برآمدہ، دروازے نیچے، انگنائی چھوٹی، زمین میں سیلن، بشری ضرورتوں کی جگہیں تاریک اور غلیظ اور عجب نہیں کہ جائے وقوع ایسی گلی در گلی ہو، کہ وہاں تک سواری کا پہنچنا دشوار ــ غرض یہ کہ وہاں کا قیام درویشوں اور زاہدوں کے لئے کیسی ہی ایک نعمت ہو، لیکن ہم تن پروروں کے لیے خود ایک مجاہدہ۔ تخیلات کچھ اسی قسم کے تھے، کہ جیپ کار کھٹ سے عین دروازے کے سامنے آرکی اور اب جو اتر کر دیکھا تو "غریب خانہ" کے درودیوار تک بجلی کی روشنی سے جھلا جھل، خاصہ صحن، خاصہ برآمدہ، خاصہ کمرہ، پرتکلف اجلا برف فرش، بستر مکلّف گدّے دار، تخت وسیع جانماز و سوزنی سے لیس، حمام اور فلش والے بیت الخلا تک جگ مگ کرتے ہوئے۔ چپل چٹی، پانی، تولیا، صابن ضرورت کی چھوٹی بڑی ہر چیز سے آراستہ پورا مکان، صفائی کے لحاظ سے آئینہ، اور سلیقہ مندی کے لحاظ سے مکین کے حسن انتظام کا آئینہ دار!

گویا جہاں تک مہمان کی راحت رسانی کے جزئیات کا تعلق ہے، یہ ندوی و مصری فاضل اگر سمت علوی کی طرف جائیے تو حکیم الامت تھانویؒ کے مدرسہ میں سبق پڑھے ہوئے، اور اگر نظر سمت سفلی تک محدود رکھیے، تو یوں کہئے کہ کسی اعلیٰ ہوٹل والے کے یہاں تربیت پائے ہوئے۔ تخیل اور واقعہ میں یہ زمین و آسمان کی نسبت دیکھ، زبان سے اور کچھ تو نہ نکلا، سوائے حیرت کے لہجہ میں دہرائے ہوئے اس فقرے کے، کہ "یہی غریب خانہ" ہے۔! اور دل یہ کہہ کر رہ گیا کہ تواضع و انکسار کے سیاق میں کیسے کیسے ثقہ حضرات تک بھی شاعری سے نہیں چوکتے!

اسلامیت کے نقش ونگار

بھوپال کل تک ایک 'اسلامی' ریاست تھی۔ حیدرآباد کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کا بہت بڑا سہارا۔ خاص شہر کی اسلامیت، دینی علوم کی قدردانی، مسجدوں کی رونق، اسلامی عدالت، قضا، خیر خیرات بندہ نوازی و یتیم پروری سے قطع نظر، باہر بھی چشمۂ فیض کس زور شور سے جاری تھا۔ علی گڑھ، ندوہ وغیرہ ملک کے طول وعرض میں بیسیوں دینی و دنیوی درسگاہوں پر ابر کرم کس طرح جھوم جھوم کر برس رہا تھا۔ کتنے خاندانوں کی پرورش ہو رہی تھی، کتنوں کی پنشنیں اور وظیفے جاری تھے اور آہ کہ آج اسلامیت کے وہ نقش ونگار کہاں سے ڈھونڈ کر لائے اور نکالے جائیں۔ دماغ میں ان خیالات کا گونجنا قدرتی تھا۔ ابھی نماز فجر میں کچھ دیر تھی کہ میزبان جائے اور ناشتہ سمیت موجود! اور دم بھر میں اسٹیشن!

مسلمانوں کے جاہ وجلال کی آخری یادگار!

راستے کے رنگ برنگ منظر بھوپال ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ دل لبھانے والے بھی اور خوف ودہشت پیدا کرنے والے بھی، زمانے کے نشیب وفراز کی ہو بہو تصویر! اٹارسی آیا، ناگپور گذرا، اور سہ پہر کو واردھا سے گذرنا ہوا۔ اور یہاں سے گاڑی کا رخ الٹا ہو گیا۔ یعنی بجائے مغرب کے مشرق کی طرف چلی۔ یاد پڑا کہ گاندھی جی کی راجدھانی مدتوں یہی شہر واردھا ہی رہا ہے۔ برسوں ہندوستان کی قسمت کے فیصلے یہیں سے صادر ہوتے رہے ہیں۔ اور سیاسیات آزادی کا رخ یہیں سے پھرا ہے۔

حق ہے کہ اسی شہر کو شمال سے جنوب کے سفر کرنے کا رخ متعین کرنے کا حق حاصل رہے -!
فجر کا وقت سکندر آباد میں آیا۔ اور مرحوم مملکت محروسہ سرکار نظام، کے حدود رات ہی میں کسی وقت شروع ہو چکے تھے۔ مرحوم و مغفور سلطنت! ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ اقبال اور مسلمانوں کے جاہ و جلال کی آخری یادگار! مٹنا اگر مقدر، ہو ہی چکا تھا، تو کاش تمام تر غیروں ہی کے ہاتھ سے مٹی ہوتی اور کوئی دخل اس میں اپنوں سے بعض کی نادانی، بے راہ روی، ناعاقبت اندیشی اور بعض کے جبن و بزدلی کو نہ ہوتا!

خوشگوار یادیں

شہر و سلطنت دونوں سے کیسی خوشگوار و کتنی قدیم یادیں وابستہ تھیں۔ پہلی آمد ۱۹۱۷ء میں اپنی عین جوانی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ کن کن ولولوں، کن کن حوصلوں، کن کن آرزوؤں اور تمناؤں سے! اور پھر کیسی کیسی صحبتیں بھی یہاں نصیب ہوئی تھیں۔ اب وہ سارے ارمان اور سارا ساز و سامان ایک خواب و خیال! بابائے اردو عبدالحق، مہاراجہ سر کشن پرشاد، سر افسر الملک، سر امین جنگ، مسعود جنگ، عماد الملک، مسز نائیڈو، مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی، امین الحسن بسمل موہانی، سید عبد المجید دہلوی اور جلیل القدر جلیل فصاحت جنگ، اختر یار جنگ، اکبر یار جنگ، صدر یار جنگ اور کتنے اور مخلص بزرگ و اعزہ، و احباب سب پیوند خاک ہو چکے! بلکہ ان میں سے اکثر کے تو نام و نشان تک مٹ چکے ہیں۔ بقول شخصے ؎

اب نہ خود ہیں نہ ہیں مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشان باقی

اب لے دے کے پرانے عزیزوں میں ایک نواب ناظر یار جنگ (پنشنر جج ہائی کورٹ) باقی رہ گئے ہیں۔ کہ انہیں کے خاندان کی کشش اس سفر پر لائی، اور انہیں کی "منزل عدل" (حیدر گوڑہ) میں فروکش ہونا مقصود ہے۔ اور ہاں بہت سے نئے مخلصین کی، جو اس درمیان میں آکر اس سرزمین میں رس بس گئے ہیں اور ان کے علاوہ شخصاً اجنبی صدق نوازوں کی ایک انبوہ در انبوہ تعداد جو محض اللہ کے واسطے، بلاکسی ذاتی غرض کے اپنے حسنِ ظن سے کام لئے ہوئے، اس بے مایہ کے ساتھ رشتہ جوڑے ہوئے اور رابطہ اخلاص و مودت قائم کئے ہوئے ـــــ حقیقت کے اعتبار سے یہ کیسے ہی دھوکے میں پڑے ہوں اور کیسی ہی سادہ دلی سے پیتل کو سونا سمجھ لینے میں مبتلا، بہرحال اجر تو اخلاص و خوش ظنی ہی کے تناسب سے ملتا ہے۔ اور دیکھئے جو گذر چکے (ومن قضیٰ نحبہ) ان کے مزار اور تربتیں تو ابھی فنا نہیں ہوئی ہیں۔ ان خاک کے ڈھیروں پہ حاضری تو زندوں کے ملنے جلنے سے بھی مقدم ہے۔

بہادر سردار

اور دکن پہنچتے ہی پہلا پروگرام ان مرحوم مخلصوں، محسنوں، بزرگوں، عزیزوں رفیقوں کی خاکی آرام گاہوں پر حاضری کا تھا، اور سب سے پہلا قدم جو اس سلسلے میں اٹھا، وہ بہادر یار جنگ رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کی طرف! کیا شخصیت تھی اور کیا شخص تھا۔ اب ناواقفوں کو کیا بتایا جائے۔ اور جو واقف ہیں انہیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ دین و ملت کے لئے ساری زندگی وقف کئے ہوئے اور بھر جوش کے ساتھ ہوش کا غیر معمولی و عدیم النظیر اجتماع! حیدرآباد کی مسلم اور نیم اسلامی سلطنت کا وجود ہی مشیت ربانی کو منظور نہ تھا کہ ایسے کلے ٹھلے کے توانا و تندرست کو یک بیک ایسے سن میں اٹھا لیا، جبکہ کہنا چاہئے کہ وہ جوان ہی تھے۔ ورنہ اس افراتفری اور اس ہولناک بربادی کی نوبت ہی کیوں آنے پاتی! بہرحال ایک نیم رہنما کی رہبری میں بڑی مسافت طے کر، اس حظیرہ تک رسائی ہوئی جس کے اندر اس شہید حق پرستی کا جسد خاکی آسودہ ہے۔ دروازہ مقفل تھا۔ اس لئے صرف جالیوں سے اندر کا کچھ نظارہ ہو سکا۔ قلب نے لطافت و حلاوت کے ساتھ ساتھ شاہانہ وقار و ہیبت کی بھی کیفیت محسوس کی۔ فاتحہ پڑھا۔ اور فاتحہ کیا پڑھا، یہ کہئے کہ درد دل کی کچھ تھوڑی سی داستان دہرا دی۔ عرض و معروض عالم تخیل میں کچھ اس قسم کی رہی:

"بہادر سردار! عین ایسے نازک وقت اپنی خستہ قوم و ملت کو بے



بہادر سردار: قائد ملت بہادر یار جنگ

سہارا چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ یہی تو خاص وقت، مخلصانہ، حکیمانہ دلیرانہ، رہنمائی کا تھا۔ ہمارا حقیقی رہنما تو وہ تھا، جو ہمیں سبق جنگ بدر اور صلح حدیبیہ دونوں کے دے گیا۔ تم اس ہادیؐ بے خطا کے نقش قدم پر چلنا، اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھے ہوئے تھے، اور اسی سراج منیر سے اپنے دیئے کو بھی روشن کیے ہوئے تھے۔ تم ہوتے تو اپنی مومنانہ فراست سے اِدھر حیدرآباد کو سنبھالے رہتے، اور اُدھر مسلم لیگ کے بھی بہترین مشیر ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو بھی ابتری کی راہ پر نہ پڑنے دیتے، لیکن خدائے بے نیاز سے کس کو مجال گلہ و شکوہ کہ عین وقت پر تمہیں کو اٹھالیا! اپنی ملت کی پستی و زبوں حالی تم کو یقیناً وہاں بھی نہ بھولے ہوگے خون کے آنسو اس کے حال زار پر بہا رہے ہوگے۔ اور جنت برزخی کی ساری نعمتوں، راحتوں، لذتوں کے باوجود یہ کانٹا دل میں برابر کھٹک ہی رہا ہوگا"

مرحوم کی خوش روئی اور خوش خوئی کی تصویر دیر تک نظر کے سامنے رہی ادائے تعزیت میں مرحوم کی ڈیوڑھی پر بھی حاضری ضروری تھی۔ گیا اور ڈیوڑھی کی سادہ آرائش کو اسی طرح پایا، جس طرح ۱۹۳۸ء میں مرحوم کی زندگی میں ان کے ساتھ کھانا کھاتے میں دیکھا تھا۔ کھانے پینے کی خاطر داریوں میں بیوہ بیگم نے اپنے مرحوم شوہر کی یاد تازہ کر دی۔ اور گفتگو میں اسی ایمانی صلاحیت کا ثبوت دیا، جس کی توقع ایسے مرد مومن کی رفیق زندگی ہی سے کی جاسکتی تھی۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی بہادر خان صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے، عین میری روانگی کے دن آئے اور بڑی محبت سے سہ پہر کو اپنی نئی کوٹھی میں چائے، زبردست ناشتہ کے ساتھ پلائی۔

مخلصین

زیارتِ قبور کے سلسلے میں دوسرا نمبر ایک عزیز، مخلص دوست سید احمد محی الدین بی۔ اے (علیگ) کا تھا۔ حیدرآباد میں اردو صحافت میرے زمانے تک (یعنی سنہ ۱۷ - وسنہ ۱۸ء میں) بالکل پرانے قسم کی تھی۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ کی صحافت کا پرتو بھی وہاں نہیں پڑا تھا۔ محی الدین حیدرآبادی جب علیگڑھ سے گریجویٹ ہوکر آئے تو انہوں نے ہمت اور اپچ سے کام لے کر ایک بالکل نئی راہ اپنے ملک وملت کے لیے مملکتِ آصفی کی سرکاری زبان اردو میں کھول دی۔ رہبرِ دکن پوری شان سے نکلا کہ چند ہی روز میں اس نے ملک بھر میں دھوم مچادی۔ شمال اور جنوبی ہندوستان اور دکن کے فرق کو اس نے توڑا۔ اور اپنی اسلامیت، انفرادیت اور صحافی ذمہ داری کا نقش دلوں پہ بٹھادیا۔ بہادر یار جنگ مرحوم کی طرح ان کا بھی ابھی سن ہی کیا تھا کہ دفعتہً اللہ کو پیارے ہوگئے۔ پتہ لگاکر (اور اس پتہ لگانے میں کوئی مدد ان کے وارثوں سے نہ مل سکی) ان کے قبرستان تک پہنچا اور حسرت وتاثر کے ساتھ ان کی تربت پر بھی فاتحہ پڑھا آج زندہ ہوتے تو میری آمد سے کس درجہ خوش ہوتے اور کس کس طرح میری خاطر مدارات میں لگ جاتے۔ صدق وسدید صدق کی جو بے پناہ محبت اہل حیدرآباد کے دلوں میں ہے کون بتا سکتا ہے کہ اس میں کتنا بڑا ہاتھ مرحوم احمد محی الدین کی مخلصانہ کوشش کو ہے۔

ان کے کتبۂ مزار کیساتھ ان کے بعض عزیزوں، مثلاً ان کے بھائی عارف الدین مرحوم، انجینئر کے کتبوں پر بھی نظر پڑ گئی اور دل سے دعائے خیر ان کے حق میں بھی نکلی۔

ان دو ایک شخصیتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد میرے ذاتی ملاقاتیوں

عزیزوں، مخلصوں کی تھی ۔ جو اب مرحومین میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس طبقہ میں سب سے پہلا نمبر مولوی سید امین الحسن بسمل موہانی مرحوم کا آتا ہے ۔ ستمبر سنہ ۱۷ء میں جب سے پہلی بار میں حیدر آباد آیا ہوں، تو یہاں کے طور طریقوں سے اجنبی محض تھا ۔ اور اپنی ذات سے شرمیلا اور خشک مزاج بھی تھا، تو یہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اسٹیٹ کے ناظم تھے ۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ چار دن نہیں ہفتوں اپنا مہمان عزیز بنائے رکھا اور میزبانی کے فریضے بڑی اولوالعزمی سے ادا کرتے رہے ۔ اس کے بعد بھی برسوں یہی معمول رہا کہ جب بھی میں حیدر آباد آیا، ان کا گھر مستقل مہمان خانہ بنا رہا ۔ بڑے ذہین بڑے زندہ دل بڑے سخن فہم، بذلہ سنج، نکتہ رس و صاحب علم تھے ۔ اور شاعری میں غالباً داغ کے شاگرد تھے ۔ حسرت موہانی کے ہم وطن ہی نہیں عزیز قریب بھی تھے ۔ بیعت ارادت سلسلہ قادریہ خاندان فرنگی محل اور خالوزادہ، رزاقیہ (بالنسبہ مضافات دریاباد) سے تھی، اس لئے میرا لحاظ زیادہ کرتے تھے ۔ اور مجھے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے ۔ شرافت اسلامی و مشرقی کے مجسمہ تھے ۔ آخری بار ملاقات سنہ ۲۸ء میں ہوئی تھی ۔ اس وقت بلدہ میں سٹی مجسٹریٹ تھے ۔ ابھی پنشن بھی نہیں لینے پائے تھے کہ بلڈ پریشر کے ایک حملہ سے نذر اجل ہو گئے ۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی تربت تک بھی رسائی ہو گئی ۔ اور دل ان کے اخلاص و وفا پر آنسو بہا کر چلا آیا ۔ مرحوم عزیزوں مخلصوں کی تعداد بہت بڑی تھی حاجی محمد یوسف رزاقی قادری دریابادی عزیز قریب تھے ان کے علاوہ مولوی علی الدین حسن پنشنر ناظم عدالت، اختر یار جنگ (ناظم محکمہ امور مذہبی) اکبر یار جنگ (جج ہائی کورٹ) مولوی غلام یزدانی (ناظم آثار قدیمہ) نواب عماد الملک، سر امین جنگ، مرزا محمد ہادی لکھنوی مرزا رسوا ۔ زور حیدر آبادی وغیرہ ہم سب کے نام نہ اس وقت یاد

پڑے نواب فوراً یاد آرہے ہیں۔ درگاہ حضرت خاموش اور جن جن قبرستانوں تک رسائی ہو سکی، سب کے مزارات پر حاضری دے لی۔ اور اس کارِ اہم سے فراغت پہلے ہی دن کرلی۔

فاضلِ گیلانی مولانا مناظر احسن صاحب کا مزار یہاں نہیں۔ ان کے وطن موضع گیلانی (بہار) میں ہے۔ اور مولانا عبد الباری ندوی تو اللہ ان کی عمر میں بہت برکت دے، ابھی ماشاء اللہ ہم ناسوتیوں ہی کے درمیان لکھنؤ میں ہیں۔ پھر بھی یہاں آکر ان دونوں یارانِ قدیم کی یاد تازہ ہو جانا بالکل قدرتی تھا۔ دونوں ایک ہی مکان میں عابد روڈ پر رہتے تھے۔ اور مجھے ان کی مہمانی کا بھی شرف شروع سنہ ۱۹۲۷ء میں حاصل رہ چکا تھا۔ ان کے بغیر شہر کچھ ویران سا نظر آیا۔ حالانکہ یہ بھی نفس کا دھوکہ ہے۔ اللہ کی آبادی کہیں کسی کے اٹھ جانے سے ویران ہوتی ہے۔

ہزاروں اٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے مجلس کی

ایک جاتا ہے تو دو اس کی جگہ آجاتے ہیں۔ نظامِ تکوینی یوں ہی بھرا پُرا چلا آرہا ہے۔ اور دنیا اپنے ربِ جلیل و قدیر کے امرِ عظیم کی تعمیل میں خاموشی کے ساتھ یوں ہی چلاتی، مارتی، پیدا کرتی، فنا کرتی، اٹھاتی، گراتی، پست کو بلند، بلند کو پست کرتی، ہنساتی، رلاتی، بڑھاتی گھٹاتی، جِتاتی، دفناتی، بناتی، بگاڑتی، اچھالتی، ٹھکراتی، چلی آرہی ہے۔ بہ قول حکیم عارف اکبر الٰہ آبادی۔

دنیا یوں ہی ناشاد یوں ہی شاد رہے گی

برباد کئے جائے گی آباد رہے گی

ہاں پیچھے ایک نام تو رہا ہی جاتا ہے۔ اس وقت بھی قریب تھا کہ رہ جائے تلاش میں غیر معمولی سرگردانی اٹھانا پڑی۔ یہاں کے ایک بڑے پرانے ملنے والوں میں یعنی سنہ ۱۹۱۷ع کے زمانے کے، ہوش بلگرامی تھے۔ ایڈیٹر، "ذخیرہ" یہ ماہ نامہ تو کچھ ہی روز بعد عتاب

شاہی میں آ کر بند ہو گیا۔ اور ہوش صاحب کو اکبارگی حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ ہوش اڑ کر بھوپال پہنچے اور شاید کسی اور ریاست میں بھی رہے آخر رام پور جا کر دم لیا۔ مجھ سے دوستانہ محبتانہ تعلقات، گردشِ ایام کے ہر دور میں قائم رکھے۔

سیاسی، دینی، اخلاقی، تصورات میں مجھ سے بہت دور تھے۔ اور مزاج و طبیعت میں بھی بہت الگ، لیکن اس سب کے باوجود رشتہ انس و مودت مجھ سے قائم رکھے ہوئے اور آخر آخر تو میرے مخلص ہی نہیں، محسن بھی ہو گئے۔ حیدرآباد جب کئی سال کے بعد دوبارہ آئے اور یہاں ہوش یار جنگ بن کر پورے عروج پر پہنچے تو جہاں تک مادی و مالی نفع پہنچانے کا تعلق ہے، میرا ہر موقع پر لحاظ رکھنے لگے، ایسا کہ مجھے شرمندہ ہو ہو جانا پڑا اور ایسا ہی رابطہ، اخلاص ان کا میں نے اپنے محترم و مخدوم دوست اور بزرگ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ بھی دیکھا، بلکہ یہی ربط اس سے ہلکے درجے میں اپنے ایک دوسرے مخدوم محترم مولانا مناظر احسن گیلانی کے ساتھ بھی پایا۔ حیرت ہوتی رہی، لیکن بہر حال واقعیت اپنی جگہ پر رہی۔ ان کی شائع شدہ بعض تحریروں سے مجھے تکلیف بھی اچھی خاصی ہوئی، لیکن میری ذات کے ساتھ انکی وابستگی میں ذرا فرق نہ آیا۔ لکھنؤ اپنے دورِ عروج میں دو بار آئے ایک بار کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے اور ایک بار نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار کے ہاں۔ دونوں بار مجھ سے ملنے اس طرح آئے، جیسے کوئی اپنے عزیز و قریب کے ہاں جاتا ہے۔ اور دونوں بار میرے نواسوں، نواسیوں سے اس طرح پیش آئے جیسے وہ خود انہیں کی نواسیاں نواسے تھے۔

بہر حال ان کا قرض مجھ پر واجب تھا۔ بڑی ہی جستجو کے بعد ان کی تربت کا پتہ چلا۔ قطبی گوڑہ کے ایک قبرستان میں ملی، جو شیعہ سنیوں کا مشترک ہے۔ وہاں جا کر فاتحہ پڑھا اور عرض معروض کچھ اس طرح پر کی۔

"بار الٰہا آپ کے اس بندے کے اور جو کچھ اعمال و احوال ہوں، وہ تو آپ ہی پر خوب روشن ہیں۔ میں حال اپنے سالقہ کا جانتا ہوں۔ میرا تو یہ شخص پورا مخلص بلکہ محسن تھا۔ اور آپ کے بعض نیک و مقبول بندوں کے سالقہ میں بھی میں نے اسے سراپا، اخلاص پایا۔ اس کی شہادت دیتا ہوں، اور التجا کرتا ہوں کہ اپنی کریمی کے صدقہ میں اس کے ساتھ معاملہ تمام تر عفو و فضل کا فرمایا جائے۔ اور اس کے حسنات کو اس کی کمزوریوں کا کفارہ اور شفیع قرار دے دیا جائے۔ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْم

شنیدم کہ در روز امید و بیم

بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم"

قدیم حیدر آباد، جدید حیدر آباد

ایک حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ صحابی کے حوالہ سے آتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلعم قَالَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَتَطَاوَلُ النَّاسُ فِی الْبُنْیَانِ	کہ رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی، جب تک لوگ بلند و بالا عمارتیں نہ بنانے لگیں۔

اور یہی نہیں کہ قربِ قیامت کے زمانے میں جسے عین ترقی و تمدن کا زمانہ سمجھا اور کہا جائے گا، بڑی بڑی عالی شان عمارتوں کی کثرت ہو گی، انہیں داخل فیشن سمجھا جانے لگے گا بلکہ یہ عالی شان عمارتیں طرح طرح سے آراستہ و منقش بھی ہوں گی۔ انہیں صحابی ابوہریرہؓ کی سند سے اس کتاب میں امام بخاریؒ نے یہ روایت بھی درج کی ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی	رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت

صلی اللہ علیہ وسلم قال لاتقوم الساعۃ حتی یبنی الناس بیوتا یشبہونہا بالمراجل ۱	تک نہ آئے گی جب تک لوگ ایسے مکان نہ بنانے لگیں، جنہیں وہ رنگین چادروں سے مشابہ کردیں گے

اور روایتیں بھی اسی مضمون سے ملتی جلتی ہیں، گویا پیغمبر اعظم نے نگاہِ کشفی سے صریحاً دیکھ لیا تھا کہ آخر زمانہ میں عالی شان، رنگین و آراستہ عمارتوں کی بڑی کثرت ہو گی اور اسے عین دلیل ترقی اور تمدنی ترقی کی، سمجھا جائے گا۔ بات غلط کیسے ہو سکتی تھی۔ دوسرے دولت مند و خوشحال ملکوں کا ذکر نہیں اپنے ہی مفلس ملک کو دیکھ لیجئے کس سرعت اور کس کثرت کے ساتھ ہر جگہ نئی نئی عالی شان، دیدہ زیب سر بہ فلک کوٹھیاں، کچہریاں، دفتر، ہوٹل، ہر ہر شہر بلکہ قصبات تک میں گرانی و مفلسی کی واویلا کے باوجود، ابھر رہے ہیں نکھر رہے ہیں! "تعمیر پروگرام" کا گویا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اپنی مجازی معنی میں نہیں لفظی معنی میں!۔

حیدرآباد اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ کیوں اور کیوں کر رہ سکتا تھا؟ قدیم حیدرآباد سلطنت آصفیہ کی حسرت نصیب یادگار بے شک مٹ چکا لیکن جدید حیدرآباد بھی انڈین یونین کی اقبال مندی اور فیروز بختی کا پرچم لہراتا ہوا، وجود میں آگیا ہے۔ بیسیوں محل اور حویلیاں جہاں اجڑی ہوئی، لٹی ہوئی، گری ہوئی، گری پڑی، ٹوٹی پھوٹی، دکھائی دیں وہیں پچاسوں نئی کوٹھیاں نئے بنگلے، ہوٹل اور سنیما گھر کالج اور اسپتال، یہ دفتر اور وہ دفتر جدت و تازگی، سرسبزی شادابی کا حق ادا کرتے ہوئے بھی نظروں کے سامنے آگئے! تخریب و تعمیر کی یہ دو گونہ نیرنگیاں، نیرنگ ساز فطرت کی ہر آنی کرشموں ہی میں سے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو

اردو کے ایک قدیم خادم کی حیثیت سے نظر اپنے رنگ و مذاق کے اداروں اور اور عمارتوں پر پڑنا بالکل قدرتی تھا۔ گو اپنے وطن یوپی میں اردو کے بے خانمائی کا حال دیکھ کر اس طرف سے مایوسی تھی اور کسی سے اردو کا پتہ نشان پوچھنے کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی اور اسٹیشن کی عمارت اور دفتروں کا منظر خود اسی یاس کو اور گہرا کرنے والا تھا۔ وہی تارگھر، اسٹیشن ماسٹر، ویٹنگ روم، مسافر خانہ وغیرہ کی عام فہم ناموں کی تختیاں سب غائب اور ان کے بجائے نامانوس اور تمامتر ناگری رسم الخط میں گڈے ہوئے، لیکن اسٹیشن سے باہر شہر کی عام آبادی میں قدم رکھتے ہی یاس کی گہری تاریکی دور ہونے لگی، اور امید کی کرنیں کسی درجہ میں نظر آنے لگیں۔ دکانوں، ہوٹلوں، مکانوں، چائے خانوں یہاں تک کہ سرکاری دفتروں کے بھی سائن بورڈوں پر اُردو حروف دکھائی دیتے اور اور کارپوریشن کی طرف سے سڑکوں پر جو مختصر ہدایتیں لکھی رہتی ہیں، وہ بھی اردو میں نظر آئیں اور دل نے کسی قدر اطمینان کا سانس لے کر کہا کہ بحمد اللہ یہاں اردو سے وہ بیزاری اردو کے نام سے وہ تعصب نہیں جو ہمارے اتر پردیش کا حصہ ہو گیا ہے! نام کی کشش جب ادارہ ادبیات اردو تک لے گئی، تو ایوان اردو کو نام کا نہیں، واقعی ایوانِ اردو ہی پایا۔ عمارت کے ظاہری حسن و جمال، وسعت و طول و عرض سے قطع نظر جب عمارت کے اندر قدم رکھا اور چل پھر کر، اِدھر اُدھر اوپر اور نیچے دیکھنا شروع کیا تو شانِ خدا نظر آئی۔ میوزیم اور لائبریری، آڈیٹوریم اور پکچر گیلیری سب ہی کچھ اس ایک ایوان کے اندر جمع! — اللہ اکبر اپنی اردو کی بھی یہ شان! قلمی کتابوں، نادر مخطوطوں کا پورا ذخیرہ فراہم۔ ریسرچ اسکالرز

(طلبہ برائے تحقیق فن) آئیں تو اپنے کام کے لیئے مدتوں قیام کا سامان پائیں۔ ان کے رہنے ٹہرنے کا انتظام بھی معقول اسی عمارت کے اندر موجود ہے لوپیا دالے اردو دشمنی کے مارے ہوئے غریب، دکن میں اردو کے اس مان دان کو سن پائیں تو خوشی سے پھولے نہ سمائیں، بلکہ عجب نہیں، جو مسرت کے ساتھ جذبۂ رشک بھی اپنے سینہ میں موجزن پائیں۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں مرحومین متقدمین کے علاوہ معاصرین تک چھوٹے بڑوں کی محفوظ، یہاں تک کہ مدیر صدق کے بدخط و خام نویس کی بھی! یہ سچ یہ ہے کہ اس احاطہ کے اندر آکر یہ بھی یاد نہیں رہ جاتا کہ اردو کوئی مظلوم زبان اور ناقدری اور کس مپرسی کی شکار ہے، یا یہ کہ کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے یا نیچے ہے! ـــــ اللہ نے خلوص میں بڑی برکت رکھی ہے۔ ڈاکٹر زور مرحوم اردو کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ نے ان کی کوششوں کو کامیابی و سرسبزی کا یہ مرتبہ عنایت کیا، اور بابائے اردو عبدالحق کا صحیح جانشین بلکہ یوں کہئے کہ بابائے اردو ثانی بنادیا!

اسی ادارے کے ایک گوشے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار میں آزاد ریسرچ انسٹیٹوٹ ہے۔ اور اس ادارہ کے دو سرگرم کارکن پروفیسر علی اکبر اور پروفیسر عبدالمجید صدیقی ہیں۔ دونوں صاحب قلم اردو ہی کے نہیں، انگریزی کے بھی۔ صدیقی صاحب تاریخ کے استاد رہ چکے ہیں۔ اور معلوم ہوا کہ ادارہ کے ارکان انتظامی میں کئی ہندو صاحبان بھی شریک ہیں۔

انجمن ترقی اردو حیدرآباد اور دیگر ادارے

اردو کے قدم دکن میں جمائے رکھنے کا سہرا تمام تر انجمن ادبیات اردو ہی کے سر نہیں۔ ایک دوسرا ادارہ بھی اس فخر میں برابر کا شریک و سہیم ہے۔ اور اس کا نام

انجمن ترقی اردو حیدرآباد ہے، بلکہ علمی، تحقیقی قدروں کا حصہ ادارہ ادبیات کیلئے چھوڑ کر اردو کی چلتو اور روزمرہ کی ضرورتوں کا جہاں تک تعلق ہے، انجمن کی کارگذاریوں بلکہ کہنا چاہئے کہ کارناموں کا نمبر کچھ بیس ہی ہے۔ ایک وسیع احاطۂ زمین اور اس کے اندر دو دو اردو کالجوں کو بڑے پیمانے پر چلانا کوئی آسان اور معمولی درجہ کی چیز نہیں اور کتابوں کی تالیف و اشاعت جو اس کے علاوہ ہے وہ ظاہر ہی ہے اور یہ سارا ثمرہ ایک بڑی حد تک، معتمدِ انجمن پروفیسر حبیب الرحمٰن کی جوان ہمتی اور ایثار کا ہے۔ اپنی ایک بڑی ذاتی عمارت انجمن کی نذر کردی ہے۔ اور خود دن رات اردو ہی کی (اور یا پھر علیگڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی) خدمت میں لگے رہتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ انجمن جسے ایسے مخلص کارکن نصیب ہوتے ہیں۔ اور اس انجمن کے چلانے میں ہاتھ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ متعدد ہندو بھی اس میں جان و دل سے شریک ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب شری جانکی پرشاد کا نام بار بار سننے میں آیا، اور انجمن کی طرف سے ایٹ ہوم میں ان سے نیاز بھی حاصل رہا۔

ہندوؤں کی شرکت اردو کے کاروبار میں یو۔پی میں بھی ہے اور وہاں کی اردو کی جدوجہد میں نام کشن پرشاد کول، وحشی بھکاری کانپوری، رام لال، آنند نرائن ملّا وغیرہ کے کون بھلا سکتا ہے، تاہم حیدرآباد میں اس شرکت و مشارکت کا مسرت انگیز منظر اور زیادہ ہی دیکھنے میں آیا۔ بلکہ ایک اور انجمن، انجمن تحفظِ اردو کے نام سے تو حال میں ہندوؤں ہی کے عنصرِ غالب سے قائم ہوئی ہے: اور اس سے بھی کچھ بڑھ کر خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ ریاست کی ساہتیہ اکاڈمی جو کام کر رہی ہے، اس میں اردو والوں کا بھی پورا حصہ ہے۔ اور تصنیف و تالیف کا کام جس طرح تلنگی وغیرہ کا اس میں ہو رہا ہے، اسی طرح اردو کا بھی

——— اردو سے شدید رقابت بلکہ دشمنی اور ضد تو شاید ہندی ہی کے لئے مخصوص

ہو چکی ہے۔ تاسل ، تلنگی وغیرہ کسی اور زبان کی بھی کد اردو سے سننے میں نہیں آئی۔

حیدرآباد کی اردو صحافت

ہر زبان کی طرح اردو کے بھی بڑے نقیب اردو کے اخبار ہیں جس خطۂ ملک میں بھی وہ نکل رہے ہوں۔ حیدرآباد کی صحافت ایک زمانہ میں بہت پست اور بالکل مبتدیوں کے درجہ کی تھی۔ رہنمائے دکن اب دکن کا ایک معروف و مقبول روزنامہ ہے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے نقشِ اوّل رہبرِ دکن کے نام سے معیارِ حال کے مطابق روزنامہ حیدرآباد سے نکالا۔ اور اپنی زندگی کے ہر دور میں اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اور جہاں تک مسلمانوں کی نمائندگی کا تعلق ہے، اپنی سنجیدگی، معقولیت، میانہ روی، اور اسلامیت کا نقش دوسروں کے دل پر بٹھائے ہوئے ہے — صدق سے اس کا رابطۂ اتحاد و حسنِ ظن شروع سے گہرا ہے، اور صدق میں اس کی مدح و ستائش کرنا ایک طرح خود ستائی ہی کرنا ہے۔ دوسرا قابلِ ذکر روزنامہ سیاست نظر پڑا۔ اور اس کے مدیر و سر دبیر عابد علی خاں صاحب سے بھی نیاز حاصل رہا۔ خاصہ سنجیدہ، ظریفانہ، معقول و پر معلومات پرچہ ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اپنا ظریفانہ کالم خوب سنبھالے ہوئے ہے، ورنہ لوگ ظرافت اور توہین، دل آزاری یا پھکڑ کے درمیان فرق ہی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور ایک تیسرا مقبول و کثیر اشاعت روزنامہ ملاپ کے نام سے دیکھنے میں آیا۔ دلی و جالندھر کے مشہور روزنامہ ملاپ کا حیدرآبادی ایڈیشن ہے، اور اب مدتوں سے مسلمانوں کی دل آزاری کے بغیر کامیابی سے نکل رہا ہے۔ ایڈیٹر شوری یدھ ویر ہیں۔ ایک ایٹ ہوم میں سرسری ملاقات رہی۔ عام تاثر اس مختصر اور پہلی ملاقات میں اچھا ہی قائم

ہوا۔ جو پرچے اکثریت کے ہاتھ میں ہیں انہیں اپنے قلم کی ذمہ داری کا خاص طور پر احساس رکھنا ہے۔ ملک کی بناؤ اور بگاڑ دونوں کی قوت بڑی حد تک انہی کے قلم کی روش سے وابستہ ہے۔ عین اسی زمانہ قیام میں ایک نئے روزنامہ صحیفہ کا پہلا نمبر ہاتھ میں آیا۔ صحیفہ نئے نہیں بہت پرانے پرچہ کا نام ہے۔ مولوی فاضل مولوی اکبر علی مرحوم کی ادارت کے زمانہ میں یہی پرچہ حیدرآباد پر چھایا ہوا تھا۔ محض پہلا نمبر دیکھ کے کوئی ذمہ دارانہ رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ خدا کرے اس کی روش اردو معاصرین میں اس کی نیک نامی کا باعث بنے۔

حیدرآباد کی تہذیبی شرافت

اردو صحافت محض اردو زبان کی صحافت نہیں، اردو کلچر کی مظہر و ترجمان ہے۔

"اردو محض ایک زبان کا نام نہیں، اردو کلچر یا تہذیب خود ایک مستقل چیز ہے۔ اردو تہذیب کا آئینہ ہے۔ اور اس آئینہ کی ساری جلا صرف ایک لفظ شرافت کے اندر مضمر ہے۔

حیدرآبادی تہذیب لکھنوی تہذیب اسی جوہر شرافت کی یادگار تھی۔ وہ جب مٹتی ہے تو ہر شریف کو اس کے مٹنے کا رنج ہوتا ہے۔

ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ تہذیبی شرافت ایسی چیز ہے۔ جو اسی دنیا میں بندوں کا دل بندوں سے جوڑے رہتی ہے۔ اور جب اس تہذیب کا جنازہ اٹھتا ہے تو ماتم داروں میں سب سے آگے شرافت ہی ہوتی ہے۔

پرانا حیدرآباد مٹا فنا ہوا۔ نظام جاگیرداری گیا۔ نئے نظام حکومت

و آئینی سیاست نے جگہ لی۔ اکثریت نے آزادی محسوس کی لیکن آخر کوئی تو بات اس مرحوم اردو کلچر میں تھی کہ جب پولیس ایکشن کے بعد ایک نامور ہندو

ایڈوکیٹ نے ازراہ ہمدردی ایک اونچے مسلمان عہدیدار سے کہا "زمانہ اگر میر محبوب علی خاں[1] کا ہوتا تو ہم خود آپ لوگوں کے ساتھ ہو کر پولیس ایکشن کا مقابلہ کرتے" تو اس مسلمان عہدیدار نے کتنا بلیغ وجامع یہ جواب دیا، کہ ـــ خیر ہم تو مر چلے خوشی اس کی ہے کہ ہم پر آنسو بہانے والے آپ بھی ہیں!"

دورِ بد اقبالی میں

قصۂ ملکۂ سبا میں ملکہ کی زبان سے قرآن مجید میں نقل ہوا ہے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ

(النمل آیت ۳۴)

بولی کہ بادشاہ جب کسی بستی میں (فتح مندانہ) داخل ہوتے ہیں۔ تو اسے تہہ و بالا کر دیتے ہیں اور اس کے معززین کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔

اور ملکۂ ملک سبا نے کہی یہ بات بڑے پتے اور بڑے تجربہ کی ـــ دنیا کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے۔ فاتح جب کسی ملک یا شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے کو بادشاہ کہیں یا جمہوریئے، یا عوامئے، یا اشتراکئے، یا جو کچھ، بہر حال مفتوحوں کے حق میں ایک عذاب ہی بن کر آتے ہیں ـــ ان کے قلعوں کو توڑنا ان کی حویلیوں کو گرانا، ان کی شان و

---

[1] مملکت حیدرآباد پر آصف جاہی خاندان کے سات بادشاہوں نے حکومت کی۔ محبوب علی خاں چھٹے بادشاہ تھے، اور اسم بامسمّیٰ! وہ ہندو مسلمان سبھی کے محبوب تھے۔ ہندوؤں کے بعض فرقے تو انہیں اوتار مانتے تھے ان کا زمانہ حکومت ۱۸۷۹ء تا ۱۹۱۱ء ہے (مرتب)

عظمت کو مٹانا، دنیا کے ہر فاتح کا عام شیوہ رہا ہے۔ اور مفتوحوں کی قسمت میں کچھ صبر کے ساتھ سہنا ہی رہتا ہے۔ حیدرآباد پولیس ایکشن کے بعد اپنے انجام پر حیرت ہی کیوں کرے؟ عاقبت اندیشی اگر ہوتی تو اس کی نوبت ہی کیوں آنے دی جاتی؟! بہرحال اس بداقبالی کا ظہور کسی درجہ میں تو ناگزیر ہی تھا۔ لیکن اللہ کا یہی بڑا فضل ہے کہ حالت نکبت زدہ اس درجہ میں دیکھنے میں نہیں آئی جس کا اندیشہ تھا، بلکہ اسے برسوں کے مسلمانوں کی خود اعتمادی پر محمول کیجئے۔ یا حکمرانوں اور ہم وطنوں کی رواداری پر (اور یہ تو واقعہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کے خلاف نہ لسانی تعصب اس پیمانہ پر ہے اور نہ دینی تعصب جس پیمانہ پر اتر پردیش میں ہے) بہرحال یہاں کے مسلمان اپنی اپنی ثقافتی، معاشرتی حالت بہت کچھ سنبھالے ہوئے ہیں مکہ مسجد تو خیر اس ڈر سے جانا نہیں ہوا کہ وہاں پہچان لیا جاؤں گا۔ اور پھر مجمع سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن جن دو ایک چھوٹی مسجدوں میں جمعہ پڑھنے یا اور کسی وقت جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں نہ صرف نمازی ہی اچھی خاصی تعداد میں دکھائی دیئے بلکہ جماعت و نماز کا انتظام اور، روشنی، فرش، صفائی، پانی وغیرہ کا اہتمام بھی تقریباً اسی حال میں ہے، جس میں دورِ نظام دکن میں تھا۔ یہ دیکھ کر جی بڑا خوش ہوا۔ اس زمانہ میں مسجدوں کے نظام ظاہری ہی کو مسلمان کہیں سنبھال لے جائیں۔ تو یہی ایک بڑی بات ہے۔

دار القرأت

نماز اور قرآن سے ملا اور جڑا ہوا مسئلہ قرات و تجوید کا ہے۔ ہندوستان میں حافظ تو خیر اب بھی تھوڑے بہت مل جاتے ہیں۔ لیکن قاری برابر کمیاب سے کمیاب تر ہوتے جاتے ہیں۔ ورنہ قرات و تجوید کا نظام بجز لکھنؤ کے مدرسۂ فرقانیہ اور ریاست کی

چند دینی درسگاہوں کے مجلا کہیں نظر آتا ہے۔ بلدہ حیدرآباد بحمد اللہ اس خصوص میں بھی اپنی امتیازی شان قائم کئے ہوئے ہے۔ ایک بڑا مرکزی ادارہ دارالقرآت کے نام سے بازار نور الامرا میں قاری کلیم اللہ صاحب حسینی ایم اے کی نگرانی و سرپرستی میں ماشاء اللہ خوب چل رہا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ قاری صاحب خود اپنی ذات سے جامع صفات ہیں۔ ایک طرف صورۃً، سیرۃً پختہ و گہرے مسلمان اور دینی علوم کے عالم اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مغربیات میں برق۔ جامعہ عثمانیہ میں فارسی کے استاد رہ چکے ہیں۔ اور اب بھی شاید اعزازی پروفیسر ہیں۔ مکان کا نام کلیم اللہ کی مناسبت سے "طور" خوب رکھا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ اس کا جلوہ بغیر کسی لن ترانی کے از خود کرا دیتے ہیں۔ اور کھانے کی میز پر جب بٹھاتے ہیں تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابھی ابھی دعائے موسوی رب انی لما انزلت من خیر فقیر، دل میں پڑھ چکے ہیں۔ مہمان کے حق میں طعامی لذتیں من و سلویٰ کا نقشہ پیش کئے ہوئے! اور چھوٹے مدرسے قرآنیات سے متعلق اور بھی متعدد ہیں۔ انہیں میں سے ایک امتحانی ادارہ دارالفرقان (لال ٹیکری) کے نام سے ہے۔ اور ایک سعید احمد مدارس (خیریت آباد) میں جہاں ایک انگریزی اور اسلامیات کی جامع قاری خاتون سعید جہاں کے اہتمام میں پردہ نشین خواتین اور لڑکیوں کے لیے حفظ قرآن و تجوید کا بندوبست ہے۔ البتہ بڑے اور چھوٹے ہر مدرسہ تجوید و قرآت میں لڑکیوں کو (دس برس کی بچیوں کو بھی) لڑکوں سے بالکل علیحدہ رکھنے کی شدید ضرورت ہے۔ اور لڑکیوں اور عورتوں کا بلا تکلف مردوں کو اپنی آواز سنانے لگنا، خود ایک فتنہ کی جڑ ہے۔ قرآن مجید کی برکت، ہرگز ایسے فتنوں کے روکنے کے لئے کافی نہیں، جیسا کہ مردانہ نفسیات کے ہر واقف کار پر روشن ہے۔

دینی درسگاہیں، اعلا، اوسط، ادنا، شہر میں بکثرت موجود ہیں اور اپنا کام کیئے جارہی ہیں۔ سب تک کیا معنی، دس فیصدی تک پہنچنا بھی نہ ممکن تھا۔ نہ اس کی کوشش ہی کی گئی۔ دو ہی چار کے معائنہ سے ایک اجمالی رائے قائم کرنے پر اکتفا کرنی

دینی سرگرمیاں

جماعت تبلیغ کا مرکز، مولد تو ہمارا شہر دہلی ہی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے کہ اس کی شاخیں، اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء کی مصداق، ہندوستان پاکستان کے ہر شہر میں کیا معنی، افریقیہ، یورپ اور امریکہ تک میں پھیل گئی ہیں۔ حیدرآباد میں اس کے خدمتی جلوے خوب خوب دیکھنے میں آئے۔ اور حیرت ہی ہوتی رہی کہ اس کی باگ کیسے کیسے لوگ سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایک ڈاکٹر ادھیڑ سن وسال کے وحید الزماں صاحب دیکھنے میں آئے۔ ایلوپیتھی کے ایم۔بی، اپنے فن میں ممتاز ایک زمانے میں شاہی طبیب بھی رہ چکے ہیں، اپنی بزرگی کے لحاظ سے قابل زیارت، اسی تحریک تبلیغ کے لیڈر! صورۃً ہمارے لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم ناظم ندوہ سے مشابہ، اور سیرت بھی انہیں کے ہم رنگ! انہیں کے ہمراہ ایک صاحب دراز ریش فوجی وردی میں ملبوس اور دکھائی دیئے۔ اپنا وقت اسی جماعت تبلیغ کے لئے وقف کئے ہوئے۔ یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن یقین کرنا پڑا کہ ہندوستانی کیا معنی، مشرقی بھی نہیں، خاص اسکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں نومسلم، یہاں نظام دکن کی ذاتی رجمنٹوں کے کرنل ہیں۔ اسی جماعت والوں کے اثر سے ولایت میں اسلام قبول کیا۔ اور اب ماشاء اللہ خود جماعت میں شریک ہوکر دوسروں کو اسلام کی طرف لا رہے ہیں۔ ایک اور ممتاز رکن اور سرگرم کارکن، سکندرآباد

کے سیٹھ حسین سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ چند ہی روز پیشتر تک سنا ہے کہ صاحب بہادر تھے، اور اب صورت شکل تک مولویانہ۔ اور نام کتنوں کے لکھے جائیں۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ ناموری و شہرت سے کوسوں دور بھاگنے والے ہیں۔

جماعت تبلیغی کے ساتھ دوسرا نام جماعت اسلامی کا یاد پڑ جانا بالکل قدرتی ہے۔ یہ جماعت بھی ہندوستان میں اپنے رنگ میں بڑا مفید کام کر رہی ہے۔ کام کی نوعیت اس سے بالکل مختلف لیکن دین و ملت کے حق میں افادیت کے لحاظ سے اس سے کم درجہ پر نہیں۔ یہاں اس کے بھی کارکنوں سے ملاقات رہی۔ اور معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ یہ بھی کام میں سرگرم عمل ہیں۔ اسلام کے سپاہیوں کو تو داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ قلب میں جلا پیدا کر کے اندر کی روحانیت و نورانیت کو بیدار کرنا، کام جماعت تبلیغی کا ہے۔ دماغ کو مغربی اور غیر اسلامی فتنہ و فسوں کے حملہ سے محفوظ کر دینا اور تاریخ و جغرافیہ، معاشیات، فلسفہ، نفسیات، طبعیات وغیرہ پڑھ چکنے کے بعد بھی شہادتِ توحید و رسالت پر قدم جمائے رکھنا، یہ دائرہ عمل جماعتِ اسلامی ہند کا ہے، جس پر شاہد عادل، اس کی لکھائی ہوئی درسی کتابیں ہیں۔

دائرۃ المعارف عثمانیہ

دوسرے دینی اداروں سے قطع نظر ایک دینی علمی ادارہ ایسا ہے جس کے لحاظ سے حیدرآباد اب تک سارے ہندوستان میں منفرد تھا، اور اب تک ہے۔ اور ہندوستان کیا معنی، اس کی نظیر اس بڑے پیمانہ پر عالم اسلامی میں بھی کمتر ہی نظر آئے گی۔ اس کا موجودہ نام دائرۃ المعارف العثمانیہ ہے۔ اس کی بنیاد تو انیسویں صدی کے آخر ہی میں پڑ چکی تھی۔ غالباً عماد الملک سید حسین بلگرامی کی تحریک پر۔ باقی پھر مولانا شبلی اور دوسرے

علماء کی کوششوں نے اسے چار چاند لگا دیئے۔ اور اس کی شہرت مصر، عراق، شام وغیرہ سے گزار کر برطانیہ، ہالینڈ، فرانس، جرمنی وغیرہ تک پہنچا دی۔ اس کا اصل کام مسلمانوں کے قدیم ذخیرہ سے نادر کتابوں کو نکال کر انہیں چھاپنا تھا۔ چنانچہ حدیث، رجال، سیرت، فقہ، کلام، لغت پر بیسوں بلکہ پچاسوں نادر کتابیں اس نے تصحیح و تہذیب کے پورے لوازم کے ساتھ چھاپ کر شائع کر دیں۔ چنانچہ سنن بیہقی، تاریخ الکبیر (بخاری) کنز العمال، المستدرک، الاستیعاب، مشکل الحدیث، مشکل الآثار، جمہرۃ اللغت، تہذیب التہذیب، تذکرۃ الحفاظ وغیرہ اپنی مطبوعہ شکل میں سب اسی ادارے کا فیض ہے۔ ابتداً یہ ادارہ، اصلاً دینی تھا۔ اور ضمناً علمی، رفتہ رفتہ یہ ترتیب کچھ الٹ سی گئی۔ اور اب یہ دینی سے زیادہ ایک علمی ادارہ ہے۔ اور اب اس میں فلسفہ، فلکیات وغیرہ کی کتابیں کچھ زیادہ ہی چھپنے لگی ہیں۔ یہاں تک کہ شاید کوئی کتاب جوتش یا نجوم کی بھی، سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہو کر اب چھپ رہی ہے۔

پہلے یہ ادارہ خود ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اور قائم بالذات تھا۔ سنہ ۴۸ء سے جامعہ عثمانیہ کے تحت آ گیا۔ اور اب شہر سے چند میل دور اس کی ایک بڑی عالیشان و وسیع عمارت یونیورسٹی کے لق و دق حلقہ کے اندر ہے۔ کتابوں کی تصحیح، مقابلہ و تہذیب یا فن سے واقف عالموں کا ایک پورا گروہ کام میں لگا رہتا ہے اور کتابوں کو یورپ ہی کے معیار پر ایڈیٹ کر کے شائع کرتا رہتا ہے۔ ادارہ ایک بہت بڑے پریس کا مالک ہے۔ پریس چھپائی کی جدید ترقیوں سے لیس ہے جنہیں میں عامی پوری طرح سمجھ بھی نہ سکا۔ صرف حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ پریس میں عربی کا اچھا ٹائپ تو خیر ہوتا ہی، انگریزی چھپائی

کا بھی پورا اسامان موجود ہے۔ چنانچہ پکتھال صاحب مرحوم کے انگریزی ترجمہ القرآن کا ایک ایڈیشن اس کا چھاپا ہوا ہے۔ اور عربی کتابوں کے تو کئی کئی نسخے بیک وقت مخطوطہ سے مطبوعہ میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ادارے کے ناظم یا ڈائرکٹر ایک فاضل اسلامیات و مستشرقیات ڈاکٹر عبد المعید خاں پی ایچ ڈی ہیں، جو نظامت ادارہ کے ہمہ وقتی و نازک کام کے علاوہ بلند پایہ انگریزی سہ ماہی اسلامک کلچر کے اڈیٹر بھی ہیں، اور شاید یونیورسٹی میں پڑھاتے بھی ہیں۔ اور اسلام کے علمی محاذ پر بھی سپاہی کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ مستشرقین کے مخفی لیکن نہایت گہرے حملوں سے مقابلہ کے لئے ہمارے قدیم حربے سب کند ہو چکے ہیں۔ اور ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضرورت ایسوں ہی کی ہے۔ جو ایک طرف اپنے عقائد و ایمانیات میں پختہ ہوں اور دوسری طرف حریفوں کے بھی ایک ایک وار کے الٹ دینے کا فن جانتے ہوں۔ ہمارے قدیم علما زہد و تقویٰ ریاضت و مجاہدہ میں جو مرتبہ بھی رکھتے ہوں، وہ اس میدان میں آنے کے بالکل ہی نا اہل ہیں ـــ فلپ ہٹی (لبنانی ثم امریکی) جو مستشرقین میں او نچا درجہ رکھتے ہیں ـــ اور ایک حد تک بحا طور پر ہمدرد اسلام بھی سمجھے جاتے ہیں ـــ ان حضرت نے اپنی مشہور عالم تاریخ عرب میں ایک ذرا سا شوشہ سلسلہ ولادت میں یہ چھوڑ دیا کہ عرب کے ایک شریف قبیلہ میں ولادت، ایسے بچہ کی ہوئی جس کے نام کی صحت غیر یقینی ہی رہے گی، بس اس پر ایک دوسرے بزرگ نے عمارت یہ کھڑی کر دی کہ محمد کوئی شخصی نام یا علم نہیں، یہ تو محض ایک توصیفی لقب ہے جسے شاعر دربار نبوت حسان بن ثابت نے اپنی ایک نعتیہ نظم میں باندھا ہے ـــ اور اسی سے قرآن نے اپنی آخری مدنی سورتوں میں لے لیا ہے! ـــ مسلمات میں شک و شبہ پیدا کر دینا، قطعیات میں رخنہ ڈال دینا، یہ وہ کمالِ تلبیس ہے کہ یہاں تک، جاہلیت کے ابو جہل،

ابولہب کا بھی ذہن نہیں پہنچ سکتا تھا! ـــ ایسے دجالی فتنوں کی روک تھام، اور ایسے باریک شبہات کا جواب اس مستشرقانہ تکنیک کو استعمال کر کے اور انہیں کے رنگ میں گھس کر عبدالمعید خان کا قلم دے سکتا ہے ـ بلکہ عجب نہیں کہ دہلی کے تازہ اجلاس مجلسِ مستشرقین میں دے بھی دیا ہو۔

انہیں ناظم ادارہ نے اپنے ادارہ کے ایک ایک کمرہ کا گشت کرایا۔ ایک ایک چیز دکھائی بتائی اور پھر کھلانے پلانے کی خاطر داریاں رئیسانہ پیمانہ پر رہیں وہ الگ! یاروں نے کیا کوئی کسر ادارہ کے بند کرا دینے کی اٹھا رکھی تھی، ادارہ مسلمانوں کا مخصوص کام کر رہا ہے، فرقہ وارانہ ہے ـــ سیکولر حکومت میں اس کا کیا کام؟ اسے فوراً القط ہونا چاہیئے۔ قریب تھا کہ فرمانِ قضا اسی مضمون کا شائع ہو جائے، اور حکومت آندھرا پردیش کے حکم سے ادارہ کے دروازوں میں قفل پڑ جائیں، لیکن حافظِ حقیقی کو یہ اور ہی منظور تھا۔ وزیرِ تعلیم سرکارِ ہند، مولانا ابو الکلام (کہ اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے) نے اپنے منصبِ عالی کی کرسی سے زبردست احتجاج نامہ بھیجا کہ "بند ہونا کیا معنی ایسے ادارہ کو تو قائم ہی نہیں اور ترقی دینا چاہیئے۔ بیرونِ ہند کی پڑھی لکھی دنیا میں تو سرکارِ ہند کی سیکولرازم کا بھرم ہی اس سے قائم ہے۔ اپنے سرکاری دورہ میں 'میں نے کیا جرمنی اور کیا فرانس، کیا برطانیہ اور کیا اٹلی سب ہی کہیں کے اہلِ علم کو اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کارناموں کے راگ گاتے ہوئے پایا۔" جب کہیں جا کر ادارہ کی جان بخشی ہوئی!

کتب خانہ آصفیہ

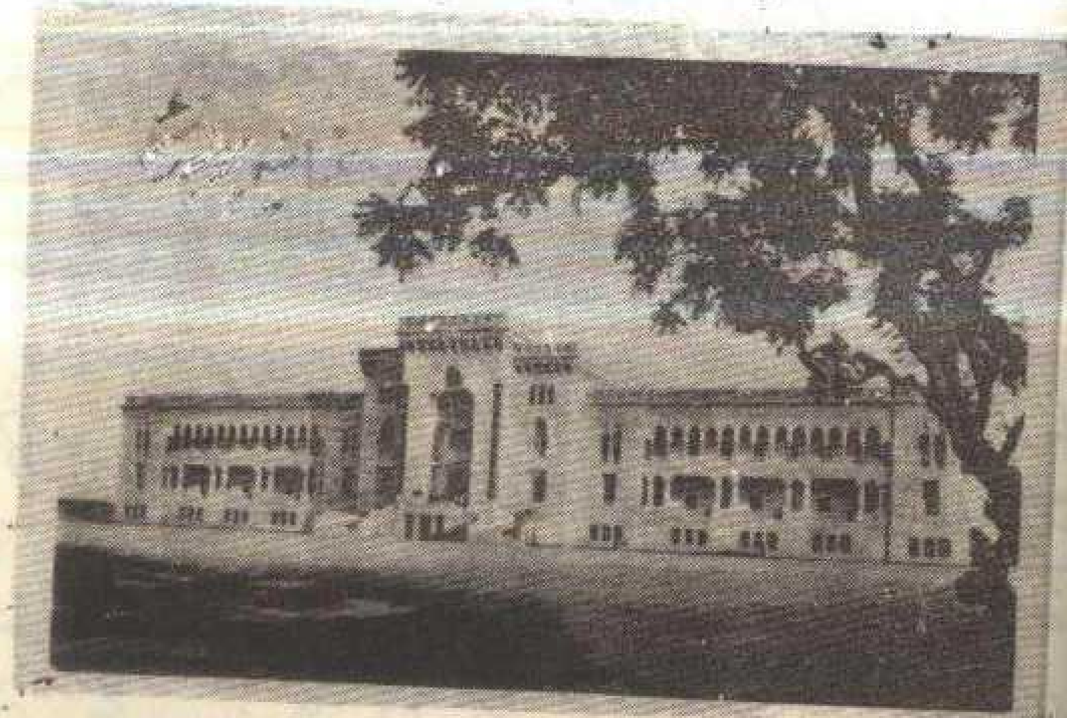
سنہ ۱۷ء ـ سنہ ۱۸ء میں جب کچھ دن جم کر رہنا۔ حیدر آباد میں ہوا تھا تو اپنے شوق و دلچسپی کی ایک خاص چیز کتب خانہ آصفیہ تھا۔ عابد شاپ سے جو سڑک

اسٹیشن کو آتی ہے، اسی کے شروع میں اس کی عمارت واقع تھی، کئی کئی سڑکیں یہاں ملتی تھیں۔ بڑے موقع کی جگہ تھی۔ ناظم کتب خانہ ہمارے ہی جوار کے لوگ تھے۔ یعنی قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی کے امامیہ خاندان کے لوگ مولوی سید تصدق حسین، سید عباس حسین وغیرہ، ہم اکثر یہاں آنا ہوتا رہتا۔ اور یہ لوگ بڑے اخلاق و محبت سے پیش آتے رہتے۔ حالانکہ میں کم عمر تھا اور یہ لوگ اچھے خاصے مسن تھے۔ کتابیں اپنی تعداد کے لحاظ سے بھی وافر تھیں۔ اور بعض ان میں سے نوادر کے حکم میں تھیں۔ یہیں ایک صاحب اور بھی رہتے تھے، اور اپنے عجیب و غریب کمالات کے لحاظ سے ملنے کے قابل تھے۔ نام عبداللہ خاں راولپنڈی کی طرف کے کہیں کے رہنے والے تھے۔ بالکل مجرد خوب گراں ڈیل سرحد والوں کی طرح، ادھیڑ سن کے، اب ہجرت کر کے یہیں کے ہو گئے تھے۔ اُمّی محض نام تک بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن علم کے شوق، حافظہ کا کمال یہ تھا کہ خدا معلوم کتنی کتابوں کے نام متعلقہ عبارتوں کے ساتھ بہ قید صفحہ و کالم ازبر تھیں، اور کتابیں محض اردو ہی کی نہیں فارسی اور عربی کی بھی خصوصاً فن تاریخ کی۔ انہیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر اگلے محدثین کی حیرت انگیز قوت حفظ کی جو کرامتیں مشہور رہی ہیں، وہ عین الیقین کے درجہ میں نظر آنے لگی تھیں۔ کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اور اس وقت کے اہل علم مولوی عبدالحق مرحوم وغیرہ سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مولانا شبلی سے بھی تعلقات رہ چکے تھے۔

بات کتب خانہ سے رونق کتب خانہ تک پہنچ گئی اب ظاہر ہے کہ کتب خانہ اس ہیئت و صورت کے ساتھ کہاں باقی رہ سکتا تھا۔ "آصفیہ" کا نام و نشان مٹ کر کتب خانہ "اسٹیٹ لائبریری" میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور اس پرانے نام سے، دور ایک نئی جگہ نئی شان سے قائم ہے۔



کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ لائبریری)



کلیۂ فنون (آرٹس کالج) جامعہ عثمانیہ

عمارت جدید[1] طرز کی اور عالی شان، وسیع احاطہ، نئی وضع، نیا سامان، عربی، فارسی کتابوں کا ذخیرہ اب بھی اچھا خاصہ ہے اور بعض نوادر کے لحاظ سے قابل دید البتہ یہ مشرقی ذخیرہ اب نیچے کی منزل میں ہے، جہاں دن دہاڑے بھی لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے بجلی کی روشنی ناگزیر ہے۔ (اور یہ تو اب جدید سرکاری اور نیم سرکاری ساری عمارتوں کے فیشن میں داخل ہو چکا ہے کہ کمروں کے اندر سارا کاروبار بجائے سورج کی روشنی کے، بجلی کی مصنوعی روشنی میں کیا جائے) ہندی اور انگریزی کی کتابوں پر پورا زور ہونا ہی تھا۔ مرہٹی وغیرہ کا بھی دور دورہ ہے، البتہ اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا رویہ اس پردیش میں بھی دکھائی دیا۔ اردو کی اتنی انجمنوں اور اردو کے اتنے ہمدردوں اور کارکنوں کے باوجود، اردو کی نئی کتابوں کی کوئی فہرست باہر آویزاں نہ ملی، برخلاف انگریزی اور ہندی کے، کہ ان کے تازہ مطبوعات کے نام مع ان کے تعارف کے بورڈ پر چسپاں تھے، اور اس ایک جزئیہ کے لحاظ سے حیدرآباد کی اسٹیٹ لائبریری کی زمین لکھنؤ کی پبلک لائبریری کے آسمان کے ہم رنگ ہی نکلی!

کتب خانہ سالار جنگ

کتاب کے کیڑے کی اصلی دلچسپی کی جگہ کتاب گھر ہی ہوتے ہیں، اور یہی شوق شہر کے ایک دوسرے مشہور کتب خانہ سالار جنگ لائبریری لے گیا — نوادر کے اعتبار سے یہ کتب

---

[1] جدید طرز کی یہ عالی شان، وسیع و عریض عمارت، رود موسیٰ کے کنارے نظام سابع اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں بصرف زر کثیر تعمیر کی گئی۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ہی کتابوں کی کثیر تعداد اور مخطوطات نوادرات بھی اسی دور میں مہیا کئے گئے۔

خانہ مشہور تر ہے کئی بار پہلے کا دیکھا ہوا تھا۔ واقع اب بھی اسی جگہ ہے۔ یعنی سالار جنگ کی ڈیوڑھی میں لیکن عمارت بالکل نئی اور دو منزلی بڑی حد تک، اپ ٹو ڈیٹ۔ لائبریری کے کارکن اچھے ملے۔ بڑی خوش اخلاقی سے ایک ایک چیز دکھاتے، بتاتے رہے، اور یہیں ملاقات تفصیل (علاوہ دوسرے موقعوں کے) مولوی نصیر الدین ہاشمی سے رہی پڑھے لکھوں اور تحقیقی کام کرنے والوں میں کون ان سے ناواقف ہوگا! اپنی ذات سے خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں۔ کتنی کتابوں اور کتاب سازوں کے نام بتے، خصوصیات کے حافظ۔ اور کتب خانوں کی ترتیب، فہرست سازی وغیرہ کے ماہر۔ ڈیوڑھی پہنچ کر خود۔ سالار جنگ ثالث نواب یوسف علی خاں مرحوم کی یاد تازہ ہو جانا ایک امر طبعی تھا۔ ان کا شاہانہ سجاوٹ کا ڈرائنگ روم، قد آدم تصویریں، قد آدم آئینے، کھانے کی میز پر یاتو تکلفات سے بھرپور۔ ان کی دلچسپ گفتگو ان کے وسیع مطالعہ مغربیات کی آئینہ دار اور ان کی اس پردیسی کے ساتھ خصوصی شفقت، ایک ایک چیز سینما کے پردوں کی طرح حافظہ کے سامنے آتی جاتی رہی اور دل کو دنیا کی ناپائیداری اور اس سے عبرت کا سبق دیتی گئی۔

اونچے اونچے مکاں تھے جن کے بڑے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

اب نہ خود ہیں نہ ہیں مکان باقی
نام کو بھی نہیں نشان باقی

مرحوم دنیا سے لاولد گئے، ان کے زمانے تک یہ کتب خانہ ان کا ذاتی و شخصی تھا، اب پبلک ہو گیا ہے۔ مرحوم تک مجھے لانے والے، اور ان سے ملانے والے، میرے ایک مخلص، بزرگ دوست سید امین الحسن بسمل مرحوم تھے، انھیں کی ریاست کے سشن جج اور ناظم تھے۔ ان کی کچہری بھی اسی احاطہ کے اندر ایک الگ عمارت میں تھی۔ ان کے

اجلاس کے کمرہ کا منظر بھی نظر کے سامنے ہو گیا۔

دیگر کتب خانے

کتب خانے شہر میں اور بھی متعدد ہیں اور بہت اچھے اچھے ہر ایک تک رسائی اور وہ بھی محدود وقت میں کہاں ممکن تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری اور بعض ذاتی کتب خانوں مثلاً شہرۂ آفاق ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی، ثم فرانسوی کے عزیز قریب ڈاکٹر یوسف الدین کے کتب خانہ کے نہ دیکھ سکنے کا افسوس آج تک قائم ہے۔ لاکھوں کی آبادی والے بڑے شہروں میں ایک بڑا مرحلہ سواری کا ہوتا ہے۔ میلوں اور کوسوں دور محلوں تک بہ آسانی پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں، جب تک کہ کوئی ہمہ وقتی تیز رفتار سواری اپنے قبضہ میں نہ ہو۔ یہاں بھی لائبریریوں وغیرہ تک پہنچنے کے لئے یہ سوال برابر سامنے آتا رہا۔ لیکن بڑی حد تک سعودی امداد و اعانت سے حل بھی ہو جاتا رہا۔ سعودی سے ذہن کہیں شاہ سعود والیٔ نجد و حجاز کی طرف منتقل نہ ہونے لگے۔ اس لئے اسی لمحہ یہ بھی سن لیجئے کہ یہاں مراد مخلص و محب قدیم پروفیسر ہارون خان شیروانی کے صاحبزادہ سعود سلمہ ہیں، جو ایسی ہر ضرورت کے وقت اپنا موٹر لئے حاضر و کمربستہ رہتے تھے۔

مجلس تعمیرِ ملت

شہر میں ملّی ادارے، چھوٹے بڑے اور گرم و نرم، خدا معلوم کتنے قائم ہیں۔ سب تک پہنچنے کی نہ ہمت ہی ہوئی۔ اور نہ فرصت تھی۔ نہ ضرورت، البتہ ایک ادارہ ضرور ایسا دیکھنے میں آگیا۔ جو شہر ہی کی نہیں ساری ریاست کی ملّی زندگی میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جس کو دیکھے بغیر واپس چلے جانا خود اپنی محرومی شمار کرتا۔

مجلس کا نام تعمیرِ ملت۔ کوئی ۱۲ سال سے قائم ہے۔ صدرِ مجلس سید خلیل اللہ حسینی، ایم، اے، ال، ال بی سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ سرگرمئ عملِ مجسم ہیں اور اس جوش کے ساتھ ہوش کے بھی بڑے حصہ دار۔ جوان، سن و سال کے اعتبار سے بھی ہیں اور اس سے کہیں زیادہ ہمت و عزم کے لحاظ سے۔ مجلس کے قیام کو کوئی ۱۲ سال ہوئے۔ اور سنہ ۴۸ء کے بعد سے ملت میں جو افسردگی، انتشار ہراس بلکہ سراسیمگی پیدا ہو گئی تھی اس کے دور کرنے اور مسلمانوں میں از سرِ نو اعتمادِ نفس پیدا کرنے میں بڑا دخل اسی مجلس کو ہے۔ مجلس کا نصب العین، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ ٹھوس کام کرنا ہے، محض نعرے لگانا اور جلوس گشت کرانا نہیں۔ جد و جہد اسلام کے خمیر میں داخل ہے۔ کہیں بزم کا رنگ رزم پر غالب ہے۔ اور جوانی کی طراری پیر دانا کی ہوشمندی کے سایہ میں قدم بڑھا رہی ہے۔ ایک سٹیڈی سرکل قائم ہے۔ جو اقبال و بہادر یار جنگ کے رنگ میں اسلام کے حقائق و معارف پر غور و مطالعہ کے بعد ان تعلیمات کو پھیلاتا، نشر کرتا رہتا ہے۔ اور دین کو ایک مکمل نظامِ حیات و دستورِ زندگی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ یوم رحمۃ للعالمین کے سلسلے میں مجلس خوب خوب مقالے لکھواتی رہتی ہے، مدرسے چلاتی ہے، طلبہ کو وظیفے دیتی ہے۔ اور نظر ملت کی مختلف جماعتوں کے اتحاد پر خاص طور سے رکھتی ہے، کمیونزم الحاد، اور ہر گمرہی کا مقابلہ اصلاحی انداز سے کرتی ہے، شعور دینی و ملی کو بیدار کرتی ہے۔ زور کردار سازی پر دیتی ہے، سیرتِ طیبہ، تفسیر، حدیث، فقہ سارے ہی دینی علوم کو تعلیم میں شامل رکھتی ہے۔ کالج گروپ اور اسکول گروپ قائم کرکے انعامات نقد بھی دیتی ہے۔ اور تمغوں سے بھی ہمت بڑھاتی ہے اور تصنیف تالیف اردو ہی میں نہیں، انگریزی میں بھی کراتی رہتی ہے۔

مدینہ مینشن کے نام سے نراین گوڑہ میں سر نظامت جنگ مرحوم کی بڑی وسیع حویلی میں مجلس کا دفتر ہے۔ سر نظامت جنگ کی شخصیت خود بڑی قابلِ قدر تھی۔ انگریزی پر عبور اہل زبان کی طرح، بے تکلف انگریزی نظموں کا ایک بڑا سا مجموعہ اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ سب سے پہلے ان کی نظمیں مولانا محمد علی کے کامریڈ میں پڑھنے میں آئی تھیں۔ وزیر سیاسیات تھے اور بڑے پختہ اور صاحبِ نظر مومن۔ حسنات اور کارِ خیر کی لمبی فہرست میں آخری یہ اضافہ کر گئے کہ ایک لق ودق عمارت اس مجلس کو دے گئے۔ دفتر جاکر دیکھا تو سلیقہ مندی، حسن انتظام، کارکردگی کا ایک مثالی نمونہ پایا۔ ہر چیز نہایت صاف ستھری بڑے ڈھنگ اور قرینے سے لگی ہوئی، سوا تصویروں کے حصہ کے کہ اس سے اپنے ذوق کو کسی طرح ہم آہنگ نہ کرسکا۔

مجلس کے ارکان سے بھی مل کر فرحت ومسرت ہی حاصل رہی اور ایک مردم بیزار شخص سے اس کا اظہار ہونا بڑی بات ہے۔ ان میں کوئی فلسفہ کا استاد ہے اور کوئی کمیونزم کے دام سے نکل کر آیا ہوا نومسلم جو کل تک کمیونزم کا پروپیگنڈسٹ تھا آج اسلام کا مطیع ہے۔ یہ فلاں فلسفہ میں ام اے ہیں اور وہ فلاں مشہور شاعر۔ فلاں ادیب اور فلاں خطیب۔ اب سب خدمتِ دین وملت میں لگے ہوئے اور ایک دوسرے کے شریک۔ جس طرح ایوانِ اردو میں قدم رکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اردو بھی کوئی بدقسمت اور مظلوم زبان ہے، اسی طرح تعمیرِ ملت کے احاطہ میں آکر یہ خیال کرنا مشکل ہوگیا کہ ملتِ اسلامی بھی کوئی منتشر بدنظم وپراگندہ حال اور غیر مطمئن جماعت ہے!

بدرالدین طیب جی

قیام ابھی حیدرآباد ہی میں تھا کہ اتفاق سے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے وائس چانسلر بدرالدین طیب جی صاحب اُدھر آنکلے اور میرے میزبان اور علیگڑھ کے مشہور فدائی ناظر یار جنگ بہادر نے انہیں اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے عصرانہ دے دیا۔ ان "بوڑھے لڑکوں" کے کرتا دھرتا یہاں جوان ہمت پروفیسر حبیب الرحمٰن ہیں (انجمن ترقی اردو والے) ان کا حسن انتظام کوئی کور کسر کیسے رہنے دیتا۔ اس تقریب میں بہت سے علیگڑھیوں سے ملاقات ہوگئی۔ ان میں سے اکثر کا شمار یہاں کے عمائد میں ہے۔ نیاز خود طیب جی صاحب سے حاصل ہوا۔ اور انگریزی تقریر اور گفتگو سننے کا اتفاق ہوا۔ آدمی وجیہہ، شریف اور بڑے صاحب عمل و کردار نظر آئے۔ علیگڑھ کی کشتی کو اس نازک وقت میں کھینا کوئی آسان چیز نہیں۔ ایسے میں ان کا دم غنیمت ہے، جبکہ کردار و ایمان کی کمزوری کی کٹی کٹی بڑی ہی افسوسناک مثالیں مسلمانوں کے اونچے اور صاحب اثر طبقہ میں موجود ہیں۔ اللہ فتنہ و شر کے ماحول میں انھیں ہر طرح محفوظ رکھے۔

فخر دکن

ڈھائی ہفتہ کے قیام میں آنا جانا بہت جگہ رہا۔ افراد کے یاں بھی، اور اداروں میں بھی لیکن سہو و نسیان تو انسان کے دم کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ ایک جگہ جانی لازمی تھی، اور اس وقت اس کا خیال نہ آیا۔ اس بے خیالی پر تو اب بھی پچھتاوا ہے۔ حیدرآباد کا اتنا لمبا سفر روز روز کیونکر ممکن ہے اور عمر کی اس منزل پر پہنچ کر اب دوبارہ سفر کا تو کوئی قرینہ ہی نہیں نظر آتا۔ اسی لئے قدرۃ" قلق بھی زیادہ ہے۔ ان قابل زیارت جگہوں میں نمبر اول پہ

نام فخرِ دین بلکہ فخرِ ہند ڈاکٹر حمید اللہ فرانسوی کے مکان کا آتا ہے۔ سچے مجاہد اور سچے مہاجر کی مثال انہیں کی ذات میں ملتی ہے ؎ علم و دین دونوں کے لیئے یہ یک وقت وقف کیے ہوئے۔ اس وقت ایک انھیں کی شخصیت ہے جو محض اپنے عقیدہ کی خاطر عمر بھر کے لیئے جلا وطنی اختیار کی۔ لازم تھا کہ ان کے مکان پر حاضری دیتا۔ ان کے رہنے سہنے اور سب سے بڑھ کر ان کے لکھنے پڑھنے کی جگہ کی دستِ عقیدت سے جاروب کشی کرتا۔ موقع ہاتھ آکر محض سہو و غفلت کی نذر ہو گیا۔ اب یہ چند سطریں بطورِ سجدۂ سہو کے ہیں۔ دو ایک جگہ کی اور ضروری حاضری بھی اس طرح رہ گئی، گو یہاں ضروری اس درجہ میں نہ تھی۔

دھوم تھی شہر میں کہ داعؔ آیا

آغازِ سفر سے پہلے ہی بڑا دھڑکا یہ لگا ہوا تھا کہ کہیں خلقت کا ہجوم نہ ہو جائے اسٹیشن پر پیشوائی کرنے والوں کا یا گھر پر ملنے والوں کا۔ صدق بلکہ اس کے پیش رو سچ کو اللہ نے جو مقبولیت حیدر آباد میں دے رکھی تھی، اس کے لحاظ سے یہ اندیشہ خواہ مخواہ

لہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ام، اے، ال، ال، بی (عثمانیہ) ڈی، لٹ (پیرس) جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر فرزند، دکن کے مایۂ ناز سپوت، کئی کتابوں کے مصنف، استادوں کے استاد اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ سقوطِ حیدر آباد کے زمانہ میں وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ لیاقت علی خان کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں اسلامی دستور کی تدوین کے سلسلہ میں جو بورڈ آف تعلیمات اسلامی قائم ہوا تھا اُس کے رکن رہے۔ تقریباً دو سال کراچی میں قیام رہا۔ پھر کچھ دل برداشتہ ہو کر پیرس چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ (مرتب)

نہ تھا اور حیدر آباد کا مقبول و معروف روزنامہ رہنمائے دکن حلقہ صدق کو برابر
وسیع سے وسیع تر کرتا رہا ہے، اس لئے ہجوم خلق سے بچنے کے لئے پیش بندی یہ کی
کہ اپنے خصوصی مخلصوں کو پہلے ہی سے لکھ بھیجا کہ آمد کی خبر ہرگز وہاں کے اخباروں
میں نہ چھپنے پائے۔ ورنہ اپنی جان عضب میں ہو جائیگی اور ممکن ہے کہ طبیعت پر گرانی اس
درجہ بڑھ جائے کہ مدت قیام ناتمام چھوڑ کر اور بغیر خاص لوگوں سے ملے ہوئے ہی واپس
چلا آنا پڑے۔ الحمدللہ کہ استدعا قبول ہو گئی۔ کسی اخبار نے اشارہ تک آمد کا نہ کیا۔ اور بجز
ایک خصوصی مخلص کے جو شب میں قاضی پیٹ جنکشن تک پہنچ گئے تھے، اور کوئی باخبر ہی نہ رہا
اور یہ صاحب بھی اس درجہ لحاظ رکھنے والے تھے کہ رات کو انہوں نے جگانا یا سکون میں
خلل ڈالنا کسی طرح مناسب نہ سمجھا، بلکہ اسی ٹرین میں بیٹھ کر صبح تڑکے سکندر آباد جنکشن
پر آکر ملے۔ اور دن نکلنے کے بعد جب حیدر آباد خاص پر اترا ہوں، بجز گنتی کے دو چار
مخصوص عزیزوں و مخلصوں کے اور کوئی نہ تھا! مقبولیت و رجعیت خلق تو اللہ کی نعمتوں
میں سے ایک نعمت ہے۔ لوگ اس کی تمنا میں رہتے ہیں۔ اس کی تدبیریں کرتے رہتے
ہیں۔ لیکن اپنا اپنا ظرف ہے۔ بعض سے اس نعمت کا تحمل ہی نہیں ہوتا۔ اور اپنا شمار بھی
اسی طبقہ میں ہے۔ اور جس نعمت کا تحمل اپنے ظرف کو نہ ہو سکے، تمنا اس کے حصول کی نہیں،
اس سے محرومی ہی کی کرتے رہنا چاہئے۔ جب زبان پر قابو نہ ہو اور قلب بھی مجمع کے سامنے
بجائے انشراح کے انقباض ہی محسوس کرے۔ تو ایسے حال میں عقل و دل دونوں کا مشورہ
گوشہ گیری یا مردم بیزاری ہی کا ہے۔ اور اس مشورہ پر عمل بھی اب ۲۵۔ ۳۰ سال سے ہے
۔ مجمع میں گھس کر فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہنا، سلسلۂ دعوت کو عام رکھنا، کام عالی ہمتوں،
جوان مردوں کا ہے۔ بدہمتوں کی راہ اس سے بالکل مختلف دوسری ہے۔

زاہد نہ داشت تابِ جمالِ پری رخاں

کنجے گرفت و ترسِ خدا را بہانہ ساخت

بہر حال یہ بہانہ سازی بڑے موقع پر کام آجاتی ہے، اور ترسِ خدا کا نقاب اختیار کرلیتی ہے۔

بھولے، بامروت، مہمان نواز حیدرآبادی

لیکن بات چھپتی کب تک رہتی۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ دو نے دس سے، اور دس نے بیس سے، اور خلقت کا تانتا لگنا شروع ہوگیا۔ یہ آرہے ہیں، اور وہ فلاں آرہے ہیں اور فلاں تنہا بھی اور ٹولیاں بناکر بھی۔ موٹر نشین بھی اور پاپیادہ بھی، کیا صبح اور کیا دوپہر اور کیا شام۔ وقت ناوقت کی کوئی قید نہیں گویا زو (چڑیا گھر) میں کوئی عجیب الخلقت جانور آگیا ہے اور تماشائیوں کے ٹھٹ اس کے دیکھنے کو لگ رہے ہیں اور پھر کن کن توقعات اور کیسی کیسی خوش اعتقادیوں کے ساتھ! خلق کو فریب دے دینا کس درجہ آسان ہے۔ اور پھر حیدرآباد کی مخلوق تو شاید کچھ اور زیادہ ہی بھولی اور سریع الاعتقاد ہے! اف رے مالک و مولا کی شان ستاری! کیسے کیسے ذرّوں کو آفتاب بناکر دکھایا جاتا ہے! کتنے سفلیوں کو روپ علویوں کا دے دیا جاتا ہے کتنے سنگ ریزوں میں تابش لعل و جواہر کی پیدا کردی جاتی ہے حیدرآبادیوں کے انس و محبت کا ان کی مسافر نوازیوں کا قائل تو شروع سے تھا، لیکن دعوتی تکلفات کا جو درجہ مشاہدہ میں آیا، اس حد تک اندازہ نہ تھا۔ آج یہاں عصرانہ ہے تو کل وہاں ظہرانہ اور پرسوں وہاں عشائیہ، دعوت، ایٹ ہوم کا ایک مسلسل چکر۔ اور بندھے ہوئے وقتوں کے علاوہ بے وقت بھی، چائے، پیسٹری اور پھل پھلاری پر اصرار۔ سارے کرم فرماؤں کے نام تو اب بھلا کہاں یاد رہ سکتے ہیں اور یاد ہوں

بھی تو اتنی لمبی چوڑی فہرست درج کر کے داستانِ سفر کہاں تک پھیلاتے چلے جائیے۔ پھر بھی کچھ نام لانے اور تذکرے کرنے بہرحال ناگزیر ہیں، کہ ان سے خود اپنے دل کو مسرت حاصل ہوگی۔ جیسا کہ قبل کے نمبروں میں مختلف اداروں کے ذیل میں مختلف شخصیتوں کے تذکرے میں حاصل ہو چکی ہے۔

جامعہ عثمانیہ، اساتذہ جامعہ عثمانیہ

قدرۃً سابقہ سب سے زیادہ یونیورسٹی والوں سے رہا۔ یونیورسٹی کو اس زمانہ میں دیکھا تھا، جب وہ شہر میں تھی، اور صرف چند بڑے کمروں اور برآمدوں اور چھوٹے چھوٹے صحنوں کا مجموعہ تھی۔ اب اس کے شباب کو اس کے بچپن سے کیا نسبت! شہر سے باہر اور مرکزی آبادی سے میلوں دور خود ایک چھوٹا سا شہر ہے، میلوں کے رقبہ میں آباد۔ یہ شعبہ قانون ہے، وہ آرٹس کالج، ادھر سائنس کی عمارتیں ہیں، ادھر لائبریری کی، ایک سے بڑھ کر ایک شاندار، وقیع و مرعوب کن۔[1] وقت گھنٹوں کا نکال کر سیر کی جائیے۔ تھک جائیے گا اور سیر تمام نہ ہو سکے گی۔ صدق نوازوں میں ایک استاد شعبہ نباتیات میں کپتان فتح یاب خان ہیں۔ خوب ملے اور خوب کھلایا پلایا۔ شعبہ مذہب و ثقافت کے استاد ڈاکٹر یوسف الدین، پرانے ملنے والے نکلے۔ کئی کئی کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔ ایک بڑے علمی خاندان کے، ڈاکٹر حمید اللہ کے عزیز ہیں۔ خود بھی سراپا علم ہیں، بلکہ علم داں بھی۔ نئی نئی کتابوں کے عنقریب طبع و اشاعت کی خوشخبریاں انھیں سے سننے میں آئیں، خصوصاً فن حدیث میں مصنف عبد الرزاق کی۔ گھنٹوں ان سے صحبت رہی اور بار بار یہ گمان گزرتا تھا کہ کسی

[1] یہ ساری عمارتیں دورِ عثمانی میں، سقوطِ حیدرآباد سے پہلے تعمیر ہو چکی تھیں (مرتب)

اچھے کتب خانے میں بیٹھے ہوئے مصروف مطالعہ ہیں یا پھر الملل والنحل (شہرستانی) کے ترجمہ کی کتاب کے ورق سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ اللہ ان کے کام میں برکت دے۔ ان سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید' صوفی منش شخصیت رکھنے والے شعبۂ فارسی کے صدر رہیں' صدق کے قدردان اس زمانے سے جب وہ سچ کے نام سے نکلتا تھا' اور یہ خود کالج کے ابتدائی درجوں کے طالب علم تھے۔ فاضل گیلانی کے چہیتے اور رشید شاگردوں میں تھے۔ ان سے مل کر شخصی، علمی، دینی ہر حیثیت سے کتنی ہی خوشگوار یادیں تازہ ہوگئیں۔ اور یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے کچھ دیر کے لئے کسی بوڑھے کی جوانی پلٹ آئی ہو!

شعبۂ تاریخ اسلام کے استاد ڈاکٹر ابونصر خالدی اپنے رنگ میں سب سے منفرد ہیں' بڑے مخلص گہرے مذہبی۔ اپنا دل کھول کر رکھ دینے والے ساتھ ہی بڑے پڑھے لکھے کہاں کہاں کی کتابیں دیکھ ڈالنے والے۔ قرآنیات کے سلسلہ میں دو ایک کتابیں ایسی ہدیۃً پیش کر دیں، جو اس کے قبل کہیں نظر سے نہیں گذری تھیں۔ جزاہ اللہ! دعوت تو ایسی کی کہ دوسروں کے لئے نظیر اور قابل تقلید' یعنی کھانا نہایت لذیذ' لیکن بس دو ہی ایک چیزیں۔ یہ نہیں کہ عام رواج کے مطابق دس چیزیں لاکر سامنے رکھ دیں۔ معدہ اس تعدد و تنوع سے الگ خراب ہو' اور نیت پھر بھی نہ بھرے' کہ اپنے پسند کی کوئی ایک چیز بھی سیر ہو کر نہ کھائی جا سکی۔ بس اسراف ہی اسراف ہاتھ آیا۔

اور میاں مظہر احسن گیلانی سلمہ' (استاد معاشیات) کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں وہ کیا ملے گویا مدت کا ایک بچھڑا ہوا عزیز مل گیا۔ میرے ایک عزیز ترین دوست و بزرگ مولانا مناظر احسن گیلانی کے آخر چھوٹے بھائی ہیں۔ صورت و سیرت دونوں میں انہیں کے مثیل و نظیر! سماع بمعرب عمداً انہیں سے پڑھوائی۔ آواز میں کچھ ویسا ہی درد و ویسا ہی رس جیسا

مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی آواز میں تھا۔ وہ مسجد دکھائی، جہاں مولانا اور
وہ مقامات دکھلائے جہاں یہ دونوں لکھتے پڑھتے اٹھتے بیٹھتے نماز پڑھتے تھے۔
کئی زبانوں سے سننے میں آئی۔ یونیورسٹی کے دو اور استادوں کی بھی اسلامیت کی تعریف
ایک ڈاکٹر وحید الدین (فلسفہ) دوسرے پروفیسر صلاح الدین کی۔ افسوس ہے
کہ دونوں سے ملاقات کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

ڈاکٹر میر ولی الدین اب یونیورسٹی میں ضابطہ سے ہوں یا نہ ہوں بہرحال ان کا تصور یونیورسٹی سے الگ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ جتنی بار ملئے طبیعت سیری حاصل نہ کرے، ملاقات کی خواہش کچھ اور بڑھتی ہی جائے۔ اور کچھ بیجا نہ ہوگا اگر انھیں سے ملنے اور ان سے استفادہ کے لئے خود ایک سفر حیدرآباد کا کیا جائے۔ فلسفہ، تصوف، اسلامیت کے جامع۔ ایک خاص تجربہ یہ ہوا کہ جہاں وہ دماغ کے لحاظ سے فلسفی ہیں، اور قلب کے اعتبار سے صوفی ہیں، ان کے دسترخوان پر جب بیٹھئے تو نہ یہ معلوم ہو کہ یہ نان جویں پر بسر کرنے والے کوئی صوفی مرتاض ہیں اور نہ تکلفات کے تقاضوں سے بے زار، کوئی خشک مزاج فلسفی، بلکہ ایوانِ نعمت ہیں۔ کیا یہ لحاظ رنگارنگی اور کیا بہ لحاظ مقدار رئیسوں، جاگیرداروں کو بھی سبق پڑھا سکتے ہیں!

ڈاکٹر سید عبد اللطیف

داستان کا یہ ٹکڑا تمام تر ناقص رہے گا، اگر ذکر کسی قدر تفصیل سے ایک حیدرآبادی شخصیت ڈاکٹر عبد اللطیف کا نہ آئے۔ اب تو ریٹائر ہو چکے ہیں، لیکن اتنا زمانہ ہے کہ کئی نسلوں کے استاد رہ چکے ہیں، یعنی ان کے پڑھائے ہوئے، ان کے سکھائے ہوئے، درجہ فضیلت

پاس کرکے خود اپنے فن کے یونیورسٹی میں استاد بھی بنے، اور اب وہ بھی ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آنکھوں کے مریض، اور اب دنیا کے ہنگاموں سے کچھ الگ تھلگ سے رہتے ہیں۔ پھر بھی بڑی گہری نظر دنیا کے حالات پر رکھتے ہیں۔ یونیورسٹی میں استاد تو شاید انگریزی ادب کے تھے۔ لیکن اب تو انکی ماہرانہ نظر سیاسیات عالم پر رہتی ہے سرسری نیازان کی خدمت میں پہلے سے تھا۔ لیکن خوب ہوا کہ اب کی ملاقاتیں بار بار اور خوب کھل کر رہیں۔ بدگمانی ان کی طرف سے دل میں یہ جمی ہوئی تھی کہ یہ متجدد مآب ہیں۔[لہ] مل کر معلوم ہوا کہ، نہیں ان کے دل میں بڑی اسلامیت ہے۔ مڈل الیسٹ (مشرق وسطی) کے کسی انسٹیٹیوٹ کے سرکاری طور پر ناظم ہیں، اور مسلم ملکوں کے حالات و انقلابات سے خوب باخبر ہیں۔ ان ملکوں کی تجدد مآبی اور فرنگیت کا ذکر بڑی دردمندی سے کرتے رہے، اور دنیا کے بعض بہترین مبصرین (مثلاً شہرہ آفاق پروفیسر ٹائن بی) سے ان کے گہرے تعلقات ہیں اس نے انہیں خود ایک بڑا مبصر بنا دیا۔ میں نے متعدد معاملات میں ان کے وسیع معلومات اور جچے تلے تبصروں سے استفادہ کیا۔ ایک روز انھوں نے بڑے وسیع پیمانہ پر جوائنٹ ہوم (عصرانہ) دیا، اس میں کہنا چاہیئے کہ پورے شہر کا عطر کھینچ کر آگیا تھا۔ کتنوں سے ملاقات گھنٹہ سوا گھنٹہ کے اندر ہو گئی۔ اور مولانا بادشاہ حسینی سے ملاقات یہیں ہوئی، مگر افسوس ہے کہ موقع زیادہ بات چیت کا نہ مل سکا۔ ڈاکٹر عبد

لہ ڈاکٹر سید عبداللطیف پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) انگریزی زبان کے ماہر غالب کے نقاد، برصغیر ہند کو ثقافتی وحدتوں (cultural zones) میں تقسیم کرنے کے محرک (Pakistan Issue) اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف۔ آخری عمر میں قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کچھ عرصہ قبل داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (مرتب)

محمود حسین خان (شعبۂ اردو) بھی ہیں دکھائی دیئے۔ علاوہ ان سے ذاتی تعلقات کے بزرگوں سے بھی دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات کی توقع تشنہ ہی رہی۔ عزیز مرزا مرحوم کے دو صاحبزادوں احمد مرزا اور ابو سعید مرزا سے بھی ملاقاتیں نہیں ہوئیں احمد مرزا اتنے فاصلہ پر تھے کہ ان سے بات چیت کی حسرت ہی رہ گئی۔ عزیز مرزا مرحوم اپنے دور کے مشاہیر ملت میں سے تھے۔ علیگڑھ کے بڑے ممتاز اولڈ بوائے، حیدر آباد کے ہوم سکریٹری، اور یہاں سے ہٹنے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری۔ ابھی ادھیڑ ہی سن کے تھے کہ سنہ ۱۹۱۰ء یا سنہ ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں پیام اجل آگیا۔ لڑکے سب کم سن ہی تھے۔ میں بی اے کا طالب علم تھا۔ ان بے چاروں کی تازہ یتیمی اور مرحوم کی کوٹھی کے ماتم کدہ میں تبدیل ہو جانے کا منظر سب آنکھوں کے سامنے پھر گیا!!

ڈاکٹر عبد اللطیف کے تعلقات مولانا ابو الکلام سے خصوصی تھے۔ ان کی ایک اور کتاب کو انگریزی کے قالب میں لائے ہیں ان کے زمانہ علالت وفات میں یہ وہیں انہیں کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ انھیں کے بیان سے معلوم ہوا کہ مرحوم جب سے غش کھا کر گرے پھر ہوش نہ آیا، اور نہ کچھ بول ہی سکے۔ صرف ایک بار وقت وفات سے چند گھنٹے قبل ذرا سے آثار ہوش آنے کے معلوم ہوئے۔ ڈاکٹری تدبیروں سے سخت کرب و اذیت میں تھے، ہونٹ ہلے اور آواز صرف اتنی سنائی دی، کہ

'چھوڑ دو، بس خدا پر چھوڑ دو'

اور بس پھر کوئی آواز اس عالم آب و گل میں نہ نکل سکی! — مبارک اور خوش قسمت ہے وہ مسلمان جس کی زبان کا آخری کلمہ خدا کا نام ہو! مضطرب کی آخری پکار چارہ ساز

حقیقی کے نام کی!

کچھ اور مشہور شخصیتیں

مشہور میر تعمیر (ARCHITECT) فیاض الدین صاحب کا نام عرصہ سے کانوں میں پڑا ہوا تھا۔ مگر خیال میں یہ بسا ہوا تھا کہ یہ دہلی یا نئی دہلی کے ہیں۔ وہیں کی عمارتوں کے سلسلے میں ان کا نام ذہن میں تھا۔ اب پتہ چلا کہ یہیں کے ہیں۔ ایک سے زائد ملاقاتیں رہیں۔ فنی شہرت ملک گیر حاصل کئے ہوئے ہیں ——— خواجہ حسن نظامی مرحوم نے انھیں کو تو بہزادِ دکن کا لقب دیا تھا ——— اس سے قطع نظر یہ معلوم ہوا کہ قوم و ملت کے معاملات میں بھی دل دردمند رکھتے ہیں۔ تعمیر ملت والوں کے اجتماع میں خاصے پیش پیش تھے۔ اور بعض اور متفرق حضرات کی ملاقات کے نقش حافظہ پر رہ گئے۔ انھیں میں سے ایک شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر عبد المنان ہیں، ان کی حذاقت کے قصے اپنے عزیزوں کی زبانی سنے اور انجمن ترقی اردو کے عصرانوں میں ان سے ملنے کی بھی مسرت حاصل رہی۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر محمد عثمان خاں سے پروفیسر مظہر احسن گیلانی کے ہاں نیاز حاصل ہوا۔ یونیورسٹی کے سررشتہ ترجمہ میں ڈاکٹری کتابوں کے اردو مترجم تھے ——— اور رسالہ ہمدرد صحت وغیرہ میں اب بھی طبی مضمون برابر لکھتے رہتے ہیں۔ ایک اتفاقی حادثہ پیش آجانے سے چلنے پھرنے سے گویا معذور ہو گئے ہیں۔ اپنے فنی کمال کے ساتھ ماشاء اللہ ایسے زبردست صاحب ایمان ہیں کہ ان سے بات چیت کرکے دوسرے کا ایمان تازہ ہو جائے ——— اور ایک اور صاحب ملے یونس سلیم صاحب، ممتاز

ایڈوکیٹ ہیں، اور ایک عرصہ تک صحافت کے کوچہ کی بھی ہوا کھاتے رہے ہیں، روزنامہ پیام والے قاضی عبدالغفار (اللہ انہیں بخشے) کے رفیقوں، جلیسوں میں تھے۔

خود بھی محبت کے نظر آئے۔ ایسے ہی ایک نعت گو شاعر، مرزا شکور بیگ سے بھی مل کر خوش ہوا۔ پیشہ کے لحاظ سے شاید یہ بھی ایڈوکیٹ ہیں اور پہلے مزاحیہ رنگ کی شاعری کرتے تھے، برجستگی آمد، اور بذلہ سنجی میں شوکت تھانوی مرحوم کی ہم طرح۔ اب شاید صرف نعت کہتے ہیں۔ اور تاثر میں ڈوب کر کہتے ہیں۔ اپنے دو محبوں، عثمانیہ یونیورسٹی کے استادوں، مولانا مناظر احسن صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی حفظہ اللہ کے متعدد شاگردوں سے ملاقاتیں رہیں۔ سب اچھے حال میں ہیں۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان دونوں کا ذکر خیر ان کے شاگردوں کی زبانوں پر برابر جاری ہے۔ ایسا بھی اب کم ہی ہوتا ہے ملنے والوں اور خاطر مدارت کرنے والوں کی فہرست مختصر و منتخب بھی ناتمام رہے گی، اگر نام نواب بہادر یار جنگ علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی نواب ماندہ رخان کا نہ لیا جائے۔ ملازمت پر کہیں باہر متعین ہیں۔ قیام کے بالکل اخیر زمانہ میں آئے۔ لیکن خلوص کی شدت، وقت کی قلت کی تلافی کے لئے بالکل کافی ہوگئی۔

سرکاری حلقوں میں رسائی کے موقع قدرتہ کم ہی نکلے۔ پھر بھی ڈاکٹر لطیف کے عصرانہ میں ایک وزیر میر احمد علی خان، وزیر اوقاف سے تو نیاز حاصل ہی ہوگیا۔ ان کا ذکر خیر زبانی بھی بہت سن چکا تھا، اور ان کی جرأت کے کارنامے اخباروں میں پڑھ چکا تھا۔ ہندوستان بھر کے ان گنتی کے دو تین منسٹروں میں ہیں، جو اپنے اسلام پر شرمندہ نہیں، اور سیکولرزم کے تقاضوں کے ساتھ اپنے ایمان کے مطالبات

و واجبات کو ہم آہنگ رکھنے کی کوشش میں برابر لگے رہتے ہیں۔ ملاقات ظاہر ہے سرسری ہی رہ سکتی تھی، تاہم جتنی دیر بھی رہی، ان کے چہرے، بشرے، اندازِ گفتگو سب سے اثر اچھا ہی قائم رہا، اور سادگی و تواضع و انکساری تو نمایاں تھی۔ ایک اور عہدہ دار محکمۂ فنانس کے سکریٹری، حامد اللہ صاحب عباسی کاکوروی سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ آدمی پڑھے لکھے ہی نظر آئے اور ساتھ ہی دین و ملت کے پورے درد مند۔ اپنے محکمہ میں نیک نامی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بھی کام آنے والے۔ لادینیت اور دینداری دونوں کے مزاج اور تقاضے الگ الگ بلکہ اکثر ایک دوسرے کے متضاد اور دونوں کے تقاضوں کو بڑی حد تک نباہ لے جانا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ خوشگوار نظیریں خوشگوار امتزاج کی اس دور میں بھی مل ہی گئی ہیں۔ ریاست مدراس میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم (صدر پبلک سروس کمیشن) اور ہماری اپنی اسٹیٹ میں سیّد صدیق حسن مرحوم (سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو) کی خوشگوار مثالیں بہت کم تعداد میں سہی، بہر حال جہاں کہیں مل جاتی ہیں، پژمردہ امیدیں نئے سرے سے شاداب ہو جاتی ہیں۔

یہاں ایک بڑا طبقہ مشائخ کے لقب سے موسوم ہے۔ سلوک اگر صحیح معنی میں ہو، جو ابوبکرؓ و علیؓ کا تھا، تو ظاہر ہے کہ اس کا کہنا ہی کیا! وہ تو ہر مسلمان کا عین ایمان اور بلند ترین نصب العین ہے۔ لیکن اس لفظ سلوک و تصوف کے پردہ میں جو ایک بڑا طلسم اوہام و رسوم کا تیار ہو گیا ہے، اب اس پر کیا کہا جائے اور یہ اس کے کہنے کا محل کچھ ہے بھی نہیں۔ خوشی اس کی ہے کہ ملاقات اس طبقہ مشائخ کے ایک ایسے فرد سے رہی،

جس کا وجود اپنے طبقہ کے لئے باعث فخر ہے۔ مولوی شاہ قطب الدین الحسینی شہر کی مرجع عام درگاہ شاہ خاموش رح کے صاحب سجادہ ہیں۔ صاحب علم ہیں۔ دینیات میں علامہ گیلانی رح کے شاگرد رہے ہیں۔ اور سارے لوازم سجادگی کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی کے ایم اے ہیں، حالانکہ وضع و قطع ایسی بنا رکھی ہے کہ انگریزی کے حرف شناس ہونے کا بھی گمان نہیں گزرتا۔ انگریزی زبان پر اتنے قادر کہ بے تکلف اس میں لکھ لکھا بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ کچھ ہی روز ہوئے کہ اسلامی تعدد ازواج کی حمایت میں ایک رسالہ انگریزی میں شائع کر چکے ہیں اور صدق میں اس کا ذکر خیر بھی آ چکا ہے۔ سلسلہ چشتیہ صابریہ ہے۔ اگر ان کے سے پڑھے لکھے اور خدمتِ دین کا ولولہ رکھنے والے ان کے طبقہ میں اور پیدا ہونے لگیں تو کہنا چاہیئے کہ امت کے ایک خاصے بڑے حصہ کا بیڑا پار ہو جائے۔

حضرت عبداللہ شاہ

شہر کے بزرگوں میں خصوصی مرجعیت مقبولیت کے تاجدار حضرت عبداللہ شاہ نظر آئے۔ جس سے بھی ملئے ان کی عقیدت کا کلمہ پڑھتے ہوئے پائیے۔ میں ان کی اس حیثیت مشیخت سے تو کچھ زیادہ واقف نہ تھا۔ البتہ انہیں علوم دینی کا سرگرم خادم حدیث سے جانتا تھا۔ محدث بغوی کی کتاب المصابیح کو سامنے رکھکر حدیث نبوی کا جو ایک بڑا اچھا مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے تبریزی نے تیار کر دیا ہے ؎ اسے امت میں قبولِ عام حاصل ہوا۔

اور وہ صدیوں سے محدثین و فقہاء، دونوں کے ہاں مستند و معتبر چلی آتی ہے، مگر اس کے مولف شافعی ہیں۔ اپنے مذہب کی رعایت، انتخاب احادیث میں کرجانا ان کے لئے بالکل قدرتی تھا۔ حنفیہ اس باب میں پچھڑے ہوئے تھے۔ مولانا کو صدیوں کے بعد اس طرف توجہ ہوئی۔ اور ایک نیا مجموعہ اسی انداز کا حنفیہ کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھ کر زجاجۃ المصابیح کے نام سے کئی جلدوں میں شائع کردیا۔ یہ کارنامہ بجائے خود اس قابل تھا۔ کہ ان کی خدمت میں حاضری ضرور دی جاتی اور ان سے اپنے حق میں دعائے خیر لی جاتی۔ اللہ انھیں عمر نوح عطا فرمائے۔ سن و سال اندازہ سے زیادہ نکلا۔ قیام مسجد میں رہتا ہے۔ ضعف نے بہت ہی نڈھال کر رکھا ہے۔ خوب ہوا کہ حاضری ہوگئی۔ چہرہ پر نور ہی نور تھا۔ بات چیت زیادہ کیا ہوتی، یہی بہت ہے کہ جو مقصود تھا، یعنی دعائے خیر لینا۔ وہ حاصل ہوگیا۔ ہاتھ پکڑ کر جب اپنے ہاتھ میں لیا ہے، تو قلب کو وہ سرور اور وہ ٹھنڈک محسوس ہوئی کہ جی یہی کہتا رہا، بس اب یہ ہاتھ اسی ہاتھ میں رہے اور اس کی گرفت کبھی نہ ڈھیلی ہونے پائے !۔ دستگیری جس اہل دل، جس اہل اللہ کی بھی نصیب ہوجائے "ایک بے سہارے کے لئے بڑا سہارا ہے !!

مولانا فضل اللہ و مولانا ابوالوفا

طبقۂ علماء کی کافی بلکہ بھرپور نمائندگی کے لئے صرف ایک ہی ذات کافی ہوگئی، مولانا فضل اللہ سابق صدر شعبۂ دینیات کے علم و فضل کے شہرے عرصہ سے سننے میں آرہے تھے۔ مراسلت بھی ہوچکی تھی، دیدار کی نوبت اب آئی۔ امام بخاری کی الادب المفرد کو بڑے اہتمام سے شرح و حاشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور مستشرقین کی دیدہ ریزی کے

ساتھ اسے "ایڈٹ" کیا ہے۔ حدیث ہی کی خدمت مشغلۂ زندگی ہے۔ صاحب حدیث کے انوار، کردار واخلاق کو کہاں تک متاثر نہ کرتے، صاف شان نائب رسول کی نظر آئی۔ علم و متانت، تواضع وانکسار کا ایک سرچشمہ اس پر علاوہ حدیث کے دوسرے علوم وفنون سے متعلق وافر معلومات کا ذخیرہ مستزاد۔ افسوس ہے کہ مولانا کو اس وقت شمالی ہند میں کام تھا اس لئے ملاقات کا موقع کم ہی ملا۔ پھر بھی جتنا ملا، دل ودماغ دونوں کی آسودگی ہی کا سامان فراہم کرتا رہا۔ شہر کے مشہور فاضل اور خادم دین، مولانا ابوالوفا افغانی اور ان کے مشہور تر ادارہ معارف النعمانیہ کے نام اور کام سے ہند و بیرونِ ہند کے علمی ودینی طبقہ میں کون ناواقف ہے؟ حنفیہ کے قدیم علمی ذخیرہ کو اپنی بیش بہا خدمات سے گراں بار کر دیا ہے اور ایسے انہماک اور یکسوئی کے ساتھ اس میں لگے ہوئے ہیں کہ جیسے دنیا کے اور کسی شغل سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ خوب ہی ملے اور ایک کم علم وکم سواد مسافر کی خوب ہی قدر افزائی کی۔ مولانا باوجود اس کے کہ اردو پر عبور ایک ہندوستانی کی طرح رکھتے ہیں، ہندی نہیں افغانی ہیں اور اس سن وسال پر بھی اپنے وطن سے بالکل بے تعلق نہیں ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی اب بھی آنا جانا رہتا ہے۔ اور اپنی جوانی تک تو بارہا آئے گئے۔ امیر امان اللہ خان کے زمانہ میں ایک بار وہیں تھے، جب امیر کی بعض جدتوں اور رنگ تجدد سے ملک کی مذہبی طبقہ میں شورش پیدا ہوئی، باتیں کچھ ایسی زیادہ متجددانہ نہ تھیں، پھر بھی وقت کے ماحول کے لحاظ سے وہاں کے علماء حق کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئیں۔ امیر کے حکم سے ملکہ ثریا کی سر دربار بے نقابی نے تیل پر دیا سلائی کا کام دیا۔ ایک مشہور ومقبول شیخ طریقت اور قاضی عدالت شیخ عبدالرحمن نے خفیہ تبلیغ جہاد شروع کی۔ سرکاری پولس دونوں کو گرفتار کر لائی۔ خیر شیخ طریقت کی جان تو کسی طرح بچ گئی۔ قاضی عبدالرحمن کو سزائے موت ملی۔ اور حکم

براہ کرنو جی طریقہ پر انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ تاریخ موعود آ ئی، تو قاضی صاحب نے کہا کہ وقتِ آخر کے لئے صرف دو باتوں کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک یہی کہ پہلے وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھوں گا اور اس کے بعد اذان دونگا۔ حالت اذان میں جس وقت اشارہ کروں عین اسی لمحہ گولی مار دی جائے۔ درخواست منظور ہوئی اور شہادت کا آرزومند اور جنت کا حریص قاضی حالتِ اذان میں جس وقت شہادتِ توحید کے بعد شہادتِ رسالت پر پہنچا، عین اسی لمحہ اشارہ کر کے فرشتہ موت کو لبیک کہا۔ فوجی دستہ نے باڑھ ماری اور قاضی اپنی مراد کو پہنچ گیا۔! ۔ خوش نصیب قاضی کی قابل رشک موت! بڑے سے بڑے متقی و زاہد کی بھی تمنا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے، کہ مولا جس گھڑی بندہ کو حاضری سے سرفراز کرنا چاہے تو بندہ کی زبان پر یہی نغمۂ جانفزا ہو، جو ہر تلخ کو شیریں اور ہر مشکل کو آسان بنا دینے والا ہے! ۔۔ ساری عبادتوں کا حاصل، ساری ریاضتوں کا نچوڑ، دو بندھے ہوئے اور مختصر سے فقروں میں! ۔۔

چند اہل اخلاص

روداد سفر ختم پر آ گئی۔ ہنس ہنس پر بھی خدا معلوم کتنوں کے نام زبانِ قلم پر آ گئے۔ اکثر کے تعظیم کے ساتھ، بعض کے عقیدت کے ساتھ اور محبت کے ساتھ تو کہنا چاہئے کہ سب ہی کے، پھر بھی چار نام ایسے بھی ہیں جو باقی رہ گئے، اور باقی ہی رہیں گے۔ سہواً وہ چھوٹ نہیں گئے، قصداً وہ چھوڑ دیئے گئے۔ تین صاحب اس میں خاص بلدہ کے ہیں اور ایک صاحب باہر کے اضلاع میں سے۔ مخصوصین کا طبقہ بھی رفیع ہوتا ہے، لیکن کچھ مخصوصین میں بھی اخص و ارفع کے مرتبہ پر ہوتے ہیں۔ یہ وہ اہل اخلاص ہیں، جن کی کوئی بھی دنیوی، مادی غرض مجھ سے وابستہ نہ تھی، انھیں مجھ سے کوئی بھی خدمت

لینا نہ تھی۔ نہ انھیں اپنے کسی ادارہ یا انجمن میں مجھے لے جانا تھا، نہ مجھ سے اپنی کتاب پر معائنہ پر کسی قسم کی داد حاصل کرنا تھی۔ نہ اپنا تعارف صدق کے ذریعہ سے کرانا تھا۔ انھوں نے خالص اللہ کے واسطے مجھ سے اپنا رشتۂ محبت قائم رکھا، یہ مجھے دیکھ کر مسرور رہا اور میں ہر مرتبہ ان کے سامنے فرطِ ندامت سے گویا زمین پر گڑا جا رہا تھا۔ "کل" انکشافِ حقائق کے وقت میں تباہ کار تو ان کے کیا کام آؤں گا، البتہ وہی ان شاء اللہ میرے لیے ایک سہارا ثابت ہوں گے۔ ان کا عمل لانرید منکم جزاءً ولا شکوراً پر تھا۔ اور ان کے پیشِ نظر یہ کلام ربانی تھا، وما لاحدٍ عندہ من نعمۃٍ تجزی الا ابتغاءَ وجہِ ربہِ الاعلیٰ۔ صفحۂ کاغذ پر ان کا ذکر لانا ان کے اخلاصِ کامل کی ناقدری کرنا ہے ان کا نام لوحِ قلب پر محفوظ رہے گا، اس عالم میں اور ان شاء اللہ اس کے بعد بھی۔ اخلاص و محبت کامل کا، کاروبار دنیا کے ہر کاروبار سے جدا ہے، اور یہاں کا دستور ہر دستور سے الگ۔ الفاظ لاکھ لائیے، حروف عبارت کی بھرمار ہزار کیجیے، کیفیتِ قلب کا نقش کیونکر کھینچ سکتا ہے، اور عبارت آرائی حقیقتِ وجدانی کی مصوری کہاں سے کر سکتی ہے؟

گرچہ تفسیرِ زبان روشن گر است
لیکن عشقِ بے زباں روشن تر است

لفظ و زبان سے شرح و تفسیر لاکھ روشن ہو
پھر بھی عشقِ بے زبان اس سے کہیں بلیغ تر ہوتا ہے۔

عشق کے معنی و مفہوم پر تحقیقی مقالہ تیار کر دینا آسان ہے اور خود عاشق ہونا چیزے دیگر!

گرچہ گویم عشق را شرح و بیان
چون بہ عشق آیم خجل باشم از آن

عشق کی تشریح و تفسیر میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے
لیکن جب خود عاشق ہو کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ
اتنا کاغذ سیاہ کر ڈالنے پر بھی کچھ نہ لکھ پائے!

حیدرآباد کی کشش

بڑی بڑی عمریں بات کہتے اور لمبی لمبی زندگیاں پلک جھپکاتے ختم ہو جاتی ہیں، تو ۱۷-۱۸ دن کی بساط ہی کیا تھی۔ ابھی حیدرآباد کے پلیٹ فارم پر آمد ہی ہوئی تھی کہ اسی اسٹیشن سے روانگی کی گھڑی بھی آگئی وہ ۲۹/ستمبر کی صبح تھی اور یہ ۲/اکتوبر کی شام! خوب یقین کے ساتھ شروع ہی سے معلوم تھا کہ قیام بالکل عارضی اور چند روزہ ہے! پھر بھی دل کسی حد تک لگ گیا تھا۔ اور طبیعت در و دیوار سے گلی کوچے سے مانوس ہو گئی تھی چلتے وقت دل کسی درجہ میں ضرور کڑھا۔ بشریت اسی کا نام ہے، بندہ کو خوب کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ زمین پر قیام بالکل ہی چند روزہ رہے گا۔ ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین

لیکن باوجود اس عقلی اذعان کے اور باوجود اس تزید کے من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ جو بندہ اپنے رب سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے، تو اس کا رب بھی اس کی ملاقات کا مشتاق رہتا ہے۔ جب وہاں سے بلاوا آتا ہے تو طبیعت ان وقتی مالوفات کو چھوڑتے کچھ انقباض ہی سا محسوس کرتی ہے۔

رخصت کی گھڑی

خیر جب شام کا وقت آیا تو کچھ لوگ تو گھر ہی پر مل ملا کر رخصت ہو گئے، اور کچھ لوگوں نے عین اس وقت رخصتی مصافحہ کر لیا، جب ابھی اسٹیشن کی برساتی ہی میں داخل ہوا تھا۔ پھر بھی گاڑی کے چھوٹتے وقت پلیٹ فارم پر مجمع مخلصوں اور محبوں کا اچھا خاصا ہو گیا۔ کالجوں کے یونیورسٹی کے جلیل القدر استاد، ایڈوکیٹ، اخبار نویس، بوڑھے جوان سب ہی اس قافلہ

میں شامل فرطِ اخلاص، اکثر کی چشمِ نم سے نمودار۔ بعض رومال سے آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ اور ایک عزیز تو درجہ کے اندر آکر مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رو دیے!

جدائی اور رخصت کا منظر بھی کتنا موثر ہوتا ہے۔ غم انگیز مگر لذیذ، تلخ مگر کتنی مٹھاس لیے ہوئے! گاڑی چلی تو عالمِ ناسوت سے آخری رخصت کا منظر سامنے آگیا۔ اور کسی فارسی گو شاعر کے یہ دو شعر بھی لوحِ حافظہ پر چمک اٹھے ـــ

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو — ہمہ خنداں بدند تو گریاں
آں چناں زی کہ وقتِ مردنِ تو — ہمہ گریاں بدند تو خنداں

(اے بندے۔ کچھ یاد ہے کہ جب تو پیدا ہوا، تو سب کے چہروں پر خوشی کی ہنسی تھی اور ایک تو رو رہا تھا۔ اب زندگی یوں گذار اور دنیا میں یوں بسر کر کہ جب دنیا سے اٹھنے کا وقت آئے تو سب رو رہے ہوں اور ایک تو خوش ہو، مگن ہو کہ واپسی اپنے اصلی وطن کو اور حاضری اپنے مولا کے دربار میں ہو رہی ہے!)

اے سب کی سننے والے! اس تباہ کار کے حق میں یہ مضمون شاعری نہیں، واقعہ اور حقیقت بن کر رہے، سب کی آنکھوں میں آنسو ہوں اور کانوں میں اپنے بشارت یہ آ رہی ہو کہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ اب دیر کیا ہے، اے بندے میرے مغفور بندوں میں شامل ہو۔ اور میری مرضیات کی جنت میں داخل ہو جا! آرزو اس ننگِ شہرت کی ہرگز نہیں کہ ایک عالم و فاضل اٹھ گیا، یا ایک عابد و زاہد اپنی جگہ خالی کر گیا۔ دعا صرف اتنی ہے کہ زمین والے زبان پر یہ لائیں کہ ہمارا ایک مخلص مشیر چلا گیا اور عرش والا یہ گواہی دے کہ ہاں یہ ہمارے دین کی تھوڑی بہت عزت رکھنے والا ہمارے حضور میں حاضر ہو گیا!



حظیرہ : آخری آرام گاہ قائد ملت
بہادر یار جنگ.